Date of Publication : 16-04-2014

PRICE Rs. 2/-

POSTED ON 17-18 April. 2014
R.N.I No. 2186/57

POSTAL REGN. NO. DL (C) -01/1195/2012-14
Licensed to Post Without Prepayment U (C)160/2012-14

HAMARI ZABAN (WEEKLY)

ہفت روزہ

# ہماری زبان

انجمن ترقی اردو (ہند) نئی دہلی

22-28 April 2014
Issue: 16, Vol.:73

۲۲ تا ۲۸ اپریل ۲۰۱۴ء
شمارہ نمبر: ۱۶، جلد نمبر: ۷۳

## وفات کے 100 ویں برس پر خصوصی پیش کش

# شمس العلما مولانا شبلی نعمانی کی ہمہ صفت شخصیت

محمد ایوب واقف (سی کوین ایونیو-بی، فلیٹ نمبر ۵۰۷، ساتویں منزل، سیکٹر ۱۴، کوپر کھیرانے، نئی ممبئی-۹)

**مولانا** شبلی نعمانی اتر پردیش کے ایک انتہائی مردم خیز ضلع اعظم گڑھ میں ۱۸۵۷ء میں پیدا ہوئے تھے۔ ان کے اور ان کے جیسے کچھ دوسرے اکابر علمائے کرام، شاعر، ادیب، محقق، نقاد مورخ اور سیرت نگار حضرات جن کا تعلق اسی سرزمین اعظم گڑھ سے رہا ہے، کو ذہن میں رکھ کر مرحوم اقبال سہیل نے اپنے ایک شعر میں اس طرح حقیقت بیانی کی ہے کہ:

اس خطۂ اعظم گڑھ پہ مگر فیضان تجلی ہے یکسر
جو ذرہ یہاں سے اٹھتا ہے وہ نیّر اعظم ہوتا ہے

اقبال سہیل کو یہ فخر حاصل تھا کہ انھوں نے نہ صرف یہ کہ ایسے نابغۂ روزگار عالم و فاضل اور شاعر و ادیب کے مکتب فکر سے گہری وابستگی اختیار کی بلکہ ان کی گراں قدر صحبتوں سے فیضیاب بھی ہوتے۔ ہم نے ابھی ابھی عرض کیا ہے کہ علامہ شبلی نعمانی نے ۱۸۵۷ء میں اس عالم رنگ و بو میں آنکھیں کھولیں اور ۵۶ سال کی قلیل عمر میں علم و ادب، تاریخ و فلسفہ اور تحقیق و تنقید کی بے مثال خدمت کرنے کے بعد ۱۹۱۴ء میں عدم کو سدھار گئے اور اپنے خوابوں کے سرچشمے دارالمصنفین کے احاطے میں مدفون ہوئے۔ کہنے کا مقصد یہ ہے کہ اپنی پیدائش سے وفات حسرت آیات تک علامہ شبلی نعمانی انگریزوں کی دراز دستی اور ریاکاری کے ہاتھوں مضطرب الحال رہے۔ شبلی نعمانی کا زمانہ دراصل دنیا کی دو بڑی تہذیبوں کے درمیان کے ٹکراؤ کا زمانہ تھا۔ مسلمانوں کو اپنی آٹھ سو سال پر مشتمل حکومت کو جسے انھوں نے اپنے خون اور پسینے سے سینچ کر مضبوط اور مستحکم بنایا تھا، اس کے چھن جانے کا بے حد ملال تھا۔ اس سے حاصل شکست خوردگی نے مسلمانوں کو من حیث القوم ایسا کاری زخم لگایا تھا کہ جس سے نجات پانے کا کوئی راستہ نظر نہیں آرہا تھا۔ آخری مغل بادشاہ بہادر شاہ کو ۲۹ ستمبر ۱۸۳۷ء کو ایسٹ انڈیا کمپنی نے شہنشاہیت سے بے دخل کر دیا تھا۔ خاندان شاہی کے افراد محض ماہانہ پنشن پر زندگی گزارنے پر مجبور ہو چکے تھے، پھر ۱۸۵۷ء کا بھیانک سال آیا جب انگریزوں کے خلاف ہندوستانیوں کی بغاوت ناکام ہو گئی، اس بغاوت کی ذمہ داری انگریزوں نے مسلمان پر ڈال دی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ بہادر شاہ ظفر کو لال قلعے سے نکال کر رنگون میں قید کر دیا گیا۔ کس مپرسی کے ایسے عالم میں جب ان کا انتقال ہوا تو انھیں اس طرح دفن کیا گیا کہ ان کی قبر کا نشان تک نہیں چھوڑا گیا۔ یہ مغل سلطنت کا دردناک انجام تھا۔

ایک طرف مسلمانوں کی روح کو ٹکڑے کردینے والی ناسازگار حالت تھی تو وہیں دوسری طرف اپنی قوم کے دردمند اور طرفدار سرسید احمد خاں کی وہ بڑی تحریک تھی جو مسلمانوں کی اسی زبوں حالی کے بطن سے پیدا ہوئی اور پھر اس نشاۃ ثانیہ کی تحریک کی کامیابی کے لیے انھوں نے ایڑی چوٹی کا زور لگا دیا۔ سرسید احمد خاں دور رس نگاہ کے حامل تھے، انھوں نے اپنی اس مشہور زمانہ تحریک جسے عرف عام میں علی گڑھ تحریک کہا جاتا ہے، کی کامیابی کے لیے ایسے رفقائے کار کی تلاش میں ہمہ تن مصروف ہو گئے جو ان کی اس تحریک میں ہر اعتبار سے ممد و معاون ہو سکتے تھے لیکن اپنے رفقائے کار کی تلاش میں انھوں نے اس امر کا خاص خیال رکھا کہ ان کی بڑی اور مشہور زمانہ تحریک میں ایسے افراد کا عمل دخل نہ ہو جن کا طریقہ کار سہل الحصول اور سہل انگار نوعیت کا حامل ہو، چنانچہ ان کی نگاہ دوربین نے ایسے مشکل وقت میں اپنے جن لائق و فائق رفقا کو اپنی صف میں لا کھڑا کیا ان میں شمس العلما مولانا شبلی نعمانی سرفہرست تھے۔

آج ایک طویل مدت گزر جانے کے بعد ہم یہ محسوس کرتے ہیں کہ سرسید احمد خاں کا انتخاب کتنا درست اور استدراک کا حامل تھا، کیوں کہ ان کی اس تحریک سے جو مشن وابستہ تھا اس مشن کی تکمیل کے لیے شبلی نعمانی جیسا مستقل مزاج مصنف ہی درکار تھا۔ شبلی نعمانی کے علاوہ جو دوسرے اہل دانش و بینش ان کے ساتھ جڑے ان میں شمس العلما مولانا الطاف حسین حالی، شمس العلما مولانا محمد حسین آزاد اور شمس العلما خان بہادر ڈپٹی نذیر احمد شامل تھے۔ سرسید احمد خاں چوں کہ اول درجے کے اہل قلم تھے اور اپنی تحریک کے عین مطابق انھوں نے بلاشبہ سیکڑوں مضامین اور مقالات لکھے۔ ان کے اپنے رسالے 'تہذیب الاخلاق' میں ان کے تہذیبی و اخلاقی نوعیت کے مضامین کا ایک طویل سلسلہ تھا جو ان کے عہد میں چلا۔ پھر انھوں نے بہت سی تاریخی نوعیت کی کتابیں بھی لکھیں جن میں 'آثار الصنادید' اور 'اسباب بغاوت ہند' وغیرہ شامل ہیں جن کے چرچوں سے ہم آج بھی محظوظ ہو رہے ہیں۔

مولانا الطاف حسین حالی بھی بہت اہم مصنف تھے، انھیں بھی سرسید احمد خاں بہت عزیز رکھتے تھے۔ انھوں نے اپنے استاد مرزا اسد اللہ خاں غالب کی بہت مربوط اور مستند سوانح حیات لکھی جس میں غالب کے حالات زندگی کے ساتھ ساتھ ان کی شاعری کا تجزیاتی مطالعہ کر کے یہ ثابت کیا کہ ایسی شاعری زوال کا شکار نہیں ہو سکتی، پھر انھوں نے فارسی کے بہت ہی مستند شاعر شیخ سعدی کی سوانح حیات 'حیات سعدی' کے نام سے سپرد قلم کی۔ ان کی ایک شہرۂ آفاق کتاب کا نام 'مقدمہ شعر و شاعری' ہے جس میں شاعری کی بنیادی اور افادی خصوصیات کا ذکر کر کے حالی نے اسے ہر عہد کے لیے اہم ترین کتاب کا درجہ دے دیا ہے۔ ان کتابوں کے علاوہ سرسید نے حالی سے 'مد و جزر اسلام' نام کی کتاب لکھوائی جو اپنی نوعیت کی انوکھی کتاب ہے۔ ہمیں سرسید کے رفقا محمد حسین آزاد اور ڈپٹی نذیر احمد کے بارے میں بھی لکھنا تھا کیوں کہ ان کا شمار اردو کے 'عناصر اربعہ' میں ہوتا ہے لیکن ایسی صورت میں ہم مولانا شبلی کے ساتھ انصاف نہیں کر پائیں گے کیوں کہ سردست تو ہمیں انھی کے بارے میں لکھنا ہے۔

مولانا شبلی نعمانی کی زندگی کی کارکردگیوں اور سرگرمیوں پر اگر ہم ایک نظر ڈالیں تو ہمیں اندازہ ہو جائے گا کہ وہ شروع سے ہی ذہانت اور فطانت کا

سرچشمہ تھے ان کے جیسے ذہین لوگ صدیوں میں کہیں پیدا ہوتے ہیں ان کو اپنی مختصر سی زندگی میں جو عالمگیر شہرت اور مقبولیت ملی وہ ان کے اہم اور یادگار کارناموں کی وجہ سے تھی۔ ان کی شہرت کا کرشمہ یہ تھا کہ اوائل زندگی میں انھوں نے اپنے جن اساتذہ سے ادبیات، معقولات اور منقولات وغیرہ کا درس لیا تھا انھیں بھی شہرت حاصل ہوگئی۔ یہاں میں ان کے صرف ایک استاد کا نام لینے پر اکتفا کروں گا اور وہ نام تھا مولانا فاروق چریا کوٹی کا۔ اب یہ ناممکن سی بات ہوکر رہ گئی ہے کہ شبلی نعمانی کی ہمہ گیر شخصیت کا مطالعہ کرنے والے اشخاص مولانا فاروق چریاکوٹی کے نام سے بے بہرہ رہ جائیں۔

شبلی نعمانی کو مشیت ایزدی کی طرف سے ایسا دل و دماغ حاصل تھا جو انھیں ایک لمحے کے لیے بھی خالی نہیں بیٹھنے دیتا تھا۔ ملت اسلامیہ کی پرانی شان و شوکت انھیں اس بات کے لیے ہمہ وقت آمادہ کیے رکھتی تھی کہ وہ اس کی کھوئی ہوئی عظمت و برتری کے حصول کے لیے اپنی زندگی کا ایک ایک لمحہ داؤں پر لگا دیں، اس جوکھم بھرے کام کے لیے جس لگن، جذبہ، محنت، لگن اور فکر کی ضرورت ہوتی ہے وہ اس کے لیے ہمہ وقت تیار رہتے تھے۔ چناں چہ انھی جذبات سے مغلوب ہوکر وہ علی گڑھ پہنچے۔ علی گڑھ میں سرسید احمد خاں کی فراخ بانہوں نے انھیں سینے سے لگایا اور انھیں ایسا لگا کہ جیسے ان کو اپنے مشن کی کامیابی کی کنجی مل گئی ہو۔ شبلی نعمانی کے مطالعے کے لیے انھوں نے اپنے ذاتی کتب خانے کا دروازہ کھول دیا اور اپنے رہائشی مکان میں ان کے رہنے سہنے کا بندوبست کیا اور اپنے علی گڑھ کالج میں درس و تدریس کے مقدس پیشے سے وابستہ کردیا۔

علی گڑھ میں قیام کے دوران شبلی کے تعلقات پروفیسر آرنلڈ سے قائم ہوئے۔ آرنلڈ سے ان کے تعلقات میں اتنی وسعت اور مضبوطی آئی کہ پروفیسر آرنلڈ نے ان کو مغربی فلسفہ و حکمت سے روشناس کرا دیا۔ انھوں نے اپنے دوست سے فرانسیسی بھی سیکھ لی اور انگریزی زبان و ادب سے بھی انھیں خوب خوب رغبت اور لگن پیدا ہوئی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اب شبلی نعمانی مغربی فکر کے رموز و نکات سے واقف ہوگئے، لیکن یہاں یہ نکتہ بھی سمجھنے کا ہے کہ سرسید کی تحریک اور ان کی سوچ سے انھیں کلی طور پر اتفاق نہیں تھا کیوں کہ سرسید مغربی انداز فکر کے جتنے قائل تھے اور انگریزوں سے جس طرح کی مفاہمت ان کا مدعا و منشا تھا شبلی کو مغربی انداز فکر سے اس درجے کی مفاہمت عزیز نہیں تھی۔ شبلی کو اپنی تہذیبی وراثت اور اپنا ملی تشخص بہرحال اپنے دل و جان سے زیادہ پسند تھا۔ اس معاملے میں وہ سرسید احمد خاں سے کسی قیمت پر بھی سمجھوتے کے لیے تیار نہیں تھے۔ سرسید اور شبلی کے مابین جو ٹکراؤ تھا وہ نظریات کا ٹکراؤ تھا۔ سرسید کے نظریات کو بھی ہم یک قلم خارج نہیں کرسکتے شاید سرسید اپنے خیالات کو اس وقت کے تناظر میں درست سمجھتے رہے ہوں اور شبلی کے نظریات بھی غلط نہیں تھے اسی لیے ایک وقت کے دو عظیم رہنماؤں میں سمجھوتہ نہیں ہوسکا۔

ہم عرض کرچکے ہیں کہ شبلی نعمانی کام میں یقین رکھتے تھے، اسی لیے وہ ایک کے بعد ایک جامع اور منفرد نوعیت کی کتاب منظر عام پر لاتے رہتے تھے۔ وہ سوانحی اور تاریخی تصانیف کو قلم بند کرنے میں ید طولیٰ رکھتے تھے۔ آج دنیا کے کتب خانے ان کی اس طرح کی کتابوں سے اپنی شان بڑھا رہے ہیں۔ ان کی ایسی کتابیں اسلام کی عظمت کو واضح کرتی ہیں۔ شبلی کی ایسی کتب میں 'المامون'، 'سیرۃ النعمان'، 'الفاروق'، 'الغزالی'، 'سوانح مولانا روم' اور 'اورنگ زیب عالمگیر پر ایک نظر' وغیرہ شامل ہیں۔ اپنی ان کتابوں کو درجۂ استناد تک پہنچانے کے لیے دنیا کے بڑے بڑے کتب خانوں کے قدیم ذخائر سے خوب خوب استفادہ کیا اس لیے ان کتابوں کے اندر کسی طرح کی غلطی یا اشتباہ کی گنجائش نہیں نکلتی۔

پروفیسر آرنلڈ کے ساتھ ان کو ایک بار مشرق وسطیٰ، مصر اور ترکی کے سفر پر جانے کا اتفاق ہوا، اس سفر کے دوران ترکی کی حکومت کی طرف سے انھیں تمغہ حاصل ہوا جو ان کے کاموں کے شایان شان تھا۔ جب وہ اپنے اس تاریخی سفر سے وطن واپس آئے تو سفر کی روداد 'سفرنامہ روم و مصر و شام' قلم بند کی۔ یہ اپنی نوعیت کا اردو میں ایسا سفرنامہ ہے جس کی مثال نہیں۔ ایسا سفرنامہ اردو میں شاید ہی لکھا گیا ہوگا۔ اردو زبان و ادب کی یہ انفرادیت کہی جائے گی کہ اس کے نادر خزانے میں مولانا شبلی نعمانی کی تحریر کردہ سوانحی تصانیف موجود ہیں، انھیں لوگ بہ نظر توقیر دیکھتے ہیں۔

سرسید احمد خاں کا جب علی گڑھ میں ۲۷؍ مارچ ۱۸۹۸ء کو انتقال ہوگیا تو شبلی نعمانی بادل ناخواستہ لکھنؤ چلے گئے، وہاں ندوۃ العلماء ۱۸۹۳ء میں قائم ہوچکا تھا اور وہ چند سال بعد اس سے وابستہ ہوئے، وہاں انھوں نے برسوں تک کام کیا اور الندوہ جیسے معیاری علمی و دینی جریدے کے مدیر رہے لیکن شبلی کی وسیع النظری اور آزاد خیالی ندوہ کے تنگ نظر علمائے کرام کو ایک آنکھ نہ بھائی نتیجہ یہ ہوا کہ انھوں نے شبلی نعمانی کے خلاف محاذ کھول دیا، آخر تنگ آکر وہ ۱۹۱۳ء میں اپنے وطن اعظم گڑھ چلے آئے۔ ایک طریقے سے ان کا اعظم گڑھ آنا باعث برکت اور دور اندیشی کا حامل ثابت ہوا کیوں کہ یہاں آکر انھوں نے اپنے دیرینہ خواب کی تکمیل کا کام شروع کردیا۔ یہاں شبلی نعمانی کے تین انتہائی اہم، وفا شعار اور دانشور تلامذہ علامہ سید سلیمان ندوی، مولانا عبدالسلام ندوی اور مولانا مسعود علی ندوی نے ان کی ہر طرح مدد کی۔ علامہ شبلی نعمانی نے جو ایک دارالمصنفین کا خواب دیکھا تھا اس کو عملی شکل دینے کا کام ان کے انھی تین شاگردوں نے حسن سے پورا کیا۔ مولانا مسعود علی ندوی نے تعمیراتی کاموں کی نگرانی کی اور علامہ سید سلیمان ندوی اور مولانا عبدالسلام ندوی شعبۂ تصنیف و تالیف کے کاموں میں مصروف ہوگئے پھر تو اس کام میں دنیا نے ایسی سرعت اور ترقی دیکھی کہ دارالمصنفین کا وجود ایک زندہ و پائندہ حقیقت بن گیا۔

یہاں ہم ایک بات کا اظہار اور کرنا چاہیں گے کہ اعظم گڑھ آنے سے قبل مولانا شبلی نعمانی نے دو انتہائی اہم اور معرکۃ آرا کتابیں سپرد قلم کیں، ایک کو دنیائے ادب 'شعرالعجم' کے نام سے جانتی ہے اور دوسری کتاب 'موازنۂ انیس و دبیر' کی حیثیت سے مشہور ہوئی۔ 'شعرالعجم' کل پانچ جلدوں پر مشتمل ہے، ان پانچ جلدوں میں چار جلدیں ایسی ہیں جن میں فارسی کے شعرا کے حالات زندگی بڑی تحقیق و تلاش اور چھان بین کے بعد نوک خامہ پر لائے گئے ہیں، شعرا کے حالات زندگی کے ساتھ ساتھ فارسی شعر و ادب کی تاریخ پر بھی تفصیل سے روشنی ڈالی گئی ہے۔ چوتھی جلد میں شعری حسن و محاسن، معیاری اور غیر معیاری شاعری کو انصاف کے ترازو میں رکھ کر تولا اور پرکھا گیا ہے۔ ہم یقین و اعتماد کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ 'شعرالعجم' جیسی کتابیں فارسی شعر و ادب کی دنیا میں نایاب ہیں کیوں کہ اس میں تنقید کا بہت اعلا اور ارفع معیار قائم کیا گیا ہے جس سے ان کی ژرف نگاہی کا پتا چلتا ہے۔ 'موازنۂ انیس و دبیر' اردو میں موازنے کی اولین کتاب ہے، اس کتاب میں کچھ لغزشیں بھی ہوئی ہیں جو فطری ہیں اس لیے کہ موازنے کے موضوع پر یہ پہلی کتاب تھی جسے مولانا شبلی نے قلم بند کرنے کی جرأت کی۔

مولانا شبلی جب اعظم گڑھ آئے اور تھوڑا انھیں اطمینان حاصل ہوا تو انھوں نے آنحضرت کی سیرت مقدسہ پر قلم اٹھایا۔ 'سیرۃ النبی' کے نام سے لکھی جانے والی اس کتاب کی ابھی دو ہی جلدیں وہ مکمل کرپائے تھے کہ پروانۂ اجل آپہنچا۔ ابھی وہ بستر مرگ پر ہی تھے کہ انھوں نے تار دے کر مولانا سید سلیمان ندوی کو فوراً اعظم گڑھ آنے کی ہدایت کی، وہ آئے تو اپنے ہاتھ میں ان کا ہاتھ لے کر 'سیرۃ النبی' کے مسودے پر رکھا۔ مولانا سید سلیمان ندوی اپنے استاد کا منشا و مدعا بھانپ گئے۔ چناں چہ مولانا شبلی کے انتقال کے بعد 'سیرۃ النبی' کی بقیہ جلدیں انھوں نے لکھ کر اپنے استاد کی آخری خواہش پوری کی۔ مولانا شبلی نے جب سیرۃ النبی پر لکھنا شروع کیا تھا تو اس کے متعلق اپنے دلی جذبات کو اس طرح پیش کیا تھا کہ:

عجم کی مدح کی عباسیوں کی داستاں لکھی
مجھے چندے مقیم آستان غیر ہونا تھا
مگر اب لکھ رہا ہوں سیرۃ پیغمبر خاتم
خدا کا شکر ہے یوں خاتمہ بالخیر ہونا تھا

لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ اللہ کے برگزیدہ اور محبوب نبی حضرت محمدؐ کی سیرت مقدسہ پر جیسی بیش قیمت کتاب کا خاکہ شبلی نعمانی نے اپنے ذہن میں سجا سنوار کر رکھا تھا وہ ان خطوط پر پہلی دو جلدوں کا کام اختتام پذیر کرچکے تھے کہ ان کے مالک حقیقی کا بلاوا آگیا اور وہ عدم کو سدھار گئے۔ اس جان لیوا بیماری سے انتقال کے بعد اس بڑی ذمہ داری کو ان کے لائق و فائق شاگرد مولانا سید سلیمان ندوی نے سنبھالا۔ کام انتہائی دشوار اور مشکل ضرور تھا لیکن شاگرد بھی کوئی ایسا ویسا نہیں تھا سید سلیمان ندوی تھے جن کی ذہانت اور فطانت کا لوہا خود ان کے استاد علامہ شبلی نعمانی نے مانا تھا۔ چناں چہ باقی پانچ جلدوں کا کام بالکل اسی نہج پر جیسا کہ ان کے سامنے موجود تھا، انجام دیا گیا، بہ حیثیت زبان کیا بہ حیثیت تحقیق اور کیا بہ حیثیت معیار و مقام اس بڑے کام کو انھوں نے شبلی نعمانی کے کام کے ہم پلہ بنا دیا۔

مولانا شبلی نعمانی اول درجے کے اردو اور فارسی کے شاعر بھی تھے، تقریباً دس سال کی عمر میں انھوں نے شعر گوئی کا شغل اختیار کرلیا تھا اور اس کام کو انھوں نے آخر عمر تک جاری رکھا۔ جب وہ اپنے حبیب خاص سرسید احمد خاں کی فرمائش پر علی گڑھ کالج میں عربی اور فارسی کے پروفیسر کی حیثیت سے پہنچے تو ان کی شاعری وہاں خوب خوب چمکی۔ انھوں نے جس رنگ و آہنگ کی شاعری کی اس کی مدح سرائی میں علامہ سر محمد اقبال، مولانا الطاف حسین حالی، طنزیہ مزاحیہ شاعری کے امام اکبر الہ آبادی اور خود سرسید احمد خاں وغیرہ رطب اللسان ہوتے۔ انھوں نے اس عہد میں رائج تقریباً سبھی اصناف میں شاعری کی۔ نظمیں لکھیں، مثنوی، قصائد اور مرثیہ وغیرہ کے ساتھ ساتھ اردو اور فارسی میں معنی و مطلب کی سج دھج سے آراستہ و پیراستہ صاف ستھری اور خوب صورت قسم کی غزلیں بھی کہیں۔ مولانا شبلی نے اپنی شاعری کے لیے جن موضوعات کا انتخاب کیا ان میں سیاسی، سماجی، قومی و ملی اور بین الاقوامی ہر طرح کے معاملات و مسائل تھے۔ وہ بڑے دور اندیش اور فکر و تدبر کے انسان تھے، اس لیے ان کی شاعری میں سطحیت نام کی چیز نہیں تھی۔ چوں کہ وہ سرسید احمد خاں کی علی گڑھ تحریک کے بڑے طرف دار تھے لہٰذا ان کی تحریک کی حمایت میں قلم اور زبان کا استعمال خوب خوب کیا کرتے تھے۔ اس بڑی اور عالمگیر تحریک کی حمایت میں انھوں نے مشہور زمانہ مثنوی 'صبح امید' لکھی۔ تین سو ترپن (353) اشعار پر مشتمل اس مثنوی کو جب وہ علی گڑھ کی مجلسوں میں لہک لہک کر پڑھتے تھے تو انھیں خوب خوب داد ملتی تھی۔ اس مثنوی کو الگ سے کتابچے کی شکل میں بھی شائع کیا گیا۔

مولانا شبلی نے اردو اور فارسی میں جو شاعری کی اس کے کئی مجموعے شائع ہوئے۔ دارالمصنفین کا جب قیام عمل میں آیا تو مولانا سید سلیمان ندوی

(بقیہ صفحہ ۷ پر)

دوسری اور آخری قسط

# تحریک۔ تفہیم۔ تدریس

پروفیسر علی احمد فاطمی
شعبۂ اردو
الہ آباد یونیورسٹی، الہ آباد

یوں تو ترقی پسندی ہر دور میں رہی ہے۔ حافظ، رومی، میر، غالب، اقبال سبھی انسان دوست تھے۔ ہر معقول فن کار ترقی پسند ہوتا ہے۔ اردو کی کلاسیکی و قدیم شاعری میں جرأت مندانہ، باغیانہ اور صوفیانہ طرز کے اشعار کی کمی نہیں، لیکن ان کا تعلق اس نوع کی ترقی پسندی سے نہ تھا جو ترقی پسند تحریک کی خصوصی دین تھی۔ تاریخی اور سماجی حوالوں سے ایسا ممکن بھی نہ تھا تاہم ان کی افادیت اور عظمت سے انکار ممکن نہیں۔ اس صداقت سے بھی انکار ممکن نہیں کہ کل کی حقیقت آج میں اور آج کی حقیقت کل میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ ماضی کے کندھے پر بیٹھ کر حال اپنے کو یوں بڑا سمجھنے لگتا ہے جیسے باپ کے کندھے پر بیٹھ کر بیٹا اپنے آپ کو باپ سے بڑا سمجھنے لگتا ہے۔ غالب کا دار و رسن ہی ترقی پسند شعراء کے یہاں مختلف استعاراتی نظام میں جھلکا۔ مجروح نے کہا:

قد و گیسو سے اپنا سلسلہ دار و رسن تک ہے

یا فیض کا یہ شعر:

مقام، فیض کوئی راہ میں جچا ہی نہیں
جو کوئے یار سے نکلے تو سوئے دار چلے

حالی، شبلی وغیرہ سے ہوتے ہوئے جب یہ سلسلہ اقبال تک پہنچتا ہے تو ان کی نظم نگاری انیسویں صدی کا نچوڑ اور بیسویں صدی کا شعور بن جاتی ہے اور کئی رنگ ایک ساتھ ابھرتے ہیں۔ روایتی تصوف نے باعمل مرد مومن یا مرد کامل کی شکل اختیار کی۔ بیسویں صدی کے انقلابات و تحریکات نے ایسے اشعار بھی کہلائے:

اٹھو مری دنیا کے غریبوں کو جگا دو
کاخِ امرا کے در و دیوار ہلا دو
جس کھیت سے دہقاں کو میسر نہیں روزی
اس کھیت کے ہر خوشۂ گندم کو جلا دو

اقبال پہلے شاعر رہے ہیں جن کے یہاں باقاعدہ انقلاب کی گونج سنائی دیتی ہے۔ اسی طرح پریم چند کا سیدھا سادہ انسان پہلے وطن پرستی کا راستہ اختیار کرتا ہے۔ اس کے بعد اخلاقیات کے حوالے سے 'بڑے گھر کی بیٹی'، 'نمک کا داروغہ' جیسی کہانیاں لکھتا ہے۔ اس کے بعد تحریک آزادی سے وابستگی۔ گاندھی جی کی قربت نے حقیقت اور اشتراکیت کی کہانیاں لکھوائیں اور کہانی پہلی بار گاؤں گلی اور نرسنگی ماحول سے نکل کر پگڈنڈی، کھیت اور چوپال میں آئی اور ہندستانی جمالیات کی ارضیت اور ثقافت نے ایک نئی جمالیات کو پیش کیا اور پریم چند کا یہ جملہ بے حد مشہور ہوا:

"ہمیں حسن کا معیار بدلنا ہوگا"۔

اس کشمکش اور ماحول میں سجاد ظہیر دنیا کی سیاست اور اشتراکی حقیقت لیے ہوئے ہندستان کے ادب میں داخل ہوئے۔ ترقی پسند اور روشن خیال ادیبوں اور شاعروں کی انجمن بنائی 'انجمن ترقی پسند مصنفین' جو بعد میں ترقی پسند تحریک میں ڈھل گئی۔ اس کے غرض و مقصد کو واضح طور پر اعلان کیا:

"اس وقت ہندستانی سماج میں انقلابی تبدیلیاں رونما ہو رہی ہیں اور جاں بلب رجعت پرستی جس کی موت لازمی اور یقینی ہے اپنی زندگی کی مدت بڑھانے کے لیے دیوانہ وار ہاتھ پاؤں مار رہی ہے۔ پرانی تہذیبی ڈھانچوں کی شکست و ریخت کے بعد سے اب تک ہمارا ادب ایک گونہ فراریت کا شکار رہا ہے اور زندگی کے حقائق سے گریز کر کے کھوکھلی روحانیت اور بے بنیاد تصور پرستی میں پناہ ڈھونڈ رہا ہے جس کے باعث اس کی رگوں میں نیا خون آنا بند ہو گیا ہے اور ادب شدید قسم کی ہیئت پرستی اور گمراہ کن منفی رجحانات کا شکار ہو گیا ہے۔ ہندستانی ادیبوں کا فرض ہے کہ وہ ہندستانی زندگی میں رونما ہونے والی تبدیلیوں کا بھرپور اظہار کریں اور ادب میں سائنسی عقلیت پسندی کو فروغ دیتے ہوئے ترقی پسند تحریکوں کی حمایت کریں۔

ہماری انجمن کا مقصد آرٹ اور ادب کو ان رجعت پرست طاقتوں کے چنگل سے نجات دلانا ہے جو اپنے ساتھ ادب اور فن کو بھی انحطاط کے گڑھوں میں دھکیل دینا چاہتے ہیں۔ ہم ادب کو عوام کے قریب لانا چاہتے ہیں اور اسے زندگی کی عکاسی اور مستقبل کی تعمیر کا مؤثر ذریعہ بنانا چاہتے ہیں"۔

ترقی پسند تحریک حقیقتاً ایک عالمگیر جد و جہد کا حصہ تھی۔ پوری دنیا کی عوامی طاقتیں ظلم اور فسطائیت کے خلاف پرچم بلند کر رہی تھیں۔ ایسے میں ساری دنیا کے ادیب، فنکار، دانشور، قلم اور قوم کے ساتھ ہمنوائی کر رہے تھے۔ ایسی صورت میں خیالی، تفریحی اور مصنوعی ادب کی گنجائش نہیں رہ گئی۔ عوام سے وابستگی، ان کے دکھ درد میں شرکت نے بہت کچھ بدلا۔ زندگی کے عام اور پامال موضوعات کی طرف سب کی نگاہیں اٹھنے لگیں۔ مزدوروں اور کسانوں کی حمایت ہونے لگی۔ انقلاب کی آوازیں گرم ہونے لگیں۔ اشتراکیت نے حقیقت کا تصور تو بدلا ہی، حسن کا معیار بھی بدلا جیسا کہ پریم چند نے کہا اور پھر سجاد ظہیر نے یہ کہا:

"ہم چاہتے ہیں کہ ہمارے قلم کی روشنائی خشک نہ ہو، ہمارے موضوعات ادب میں باسی پن نہ آئے۔ ہمارے ذہن اور فکر کو نئی غذا ملتی رہے تو ہمیں اپنا رشتہ عوام سے جوڑے رکھنا چاہیے۔ محنت کش اور متوسط طبقے کی سماجی زندگی سے بہتر اور کوئی موضوع ادب کے لیے ممکن نہیں"۔

راست طور پر عوام سے رشتہ جوڑنے کی ضد سے عوامی مسائل آئے۔ عوامی موضوعات جس سے اردو ادب تقریباً نابلد تھا، ادب عالیہ کا حصہ بننے لگے۔ بدصورتی میں حسن تلاش کیا گیا۔ ظاہر ہے کہ یہ ایک مشکل عمل تھا۔ ایک طرف صدیوں کی روایتی جمالیات سے انحراف کرنا اور دوسری طرف کھردری جمالیات کو پیش کرنا جس سے اردو کا قاری ناواقف اور نامانوس تھا اس کے باوجود یہ ہوا کہ بدصورت اور غریب دھنیا اردو ناول کی تمام خوب صورت ہیروئنوں کو روند کر لازوال کردار بن گئی، جس نے اور آگے بڑھ کر راتو، شمن، لاجونتی، سوگندھی، رضیہ جیسے لافانی کردار دیے۔ اسی طرح ہوری سے لے کر دادا اور بچن کے بچے اردو ناول کے زندۂ جاوید کردار قرار پائے۔

اردو ادب کی کھوکھلی اور مصنوعی رومان پرور دنیا میں پہلے رومانی حقیقت اس کے بعد اشتراکی حقیقت کے بادل منڈلائے اور اردو شاعری کا محبوب و معشوق جو چلمن کی آڑ سے جاگیردارانہ تہذیب کی زوال پذیر صورت حال کو کن انکھیوں سے دیکھ رہا تھا، اچانک اپنے آپ کو تمام قید و بند سے آزاد کر کے پہلے جنگل کی شہزادی پھر نجمہ خانقاہ اور اس کے بعد سماج کے دوسرے شعبوں میں جا کر دفتر، اسکول، کھیت، چوپال میں رچ بس گیا۔ مجاز نے تو پرچم انقلاب اٹھا لینے کو کہا

ترے ماتھے پہ یہ آنچل بہت ہی خوب ہے لیکن
تو اس آنچل سے اک پرچم بنا لیتی تو اچھا تھا

اور کیفی اعظمی نے کہا:

اپنی تاریخ کا عنوان بدلنا ہے تجھے
اٹھ مری جان مرے ساتھ ہی چلنا ہے تجھے

غرض کہ اشتراکیت نے پر پھیلائے، حقیقت بیباک اور تہ دار ہوئی اور پھر یہ فلسفہ بھی سامنے آیا کہ حقیقت جتنی تہ دار ہوگی جمالیات اتنی ہی نازک ہوگی۔ ان سب معاملات میں اختلاف و اتفاق کے عناصر ابھرنے ہی تھے کہ روایتی اور فرسودہ نظام تبدیلیوں کو آسانی سے قبول نہیں کرتا، لیکن ترقی پسند ادیبوں کا اعلان تھا کہ وہ تبدیلی پر یقین رکھتے ہیں اور یہ تبدیلی اپنے آپ نہیں ہوا کرتی بلکہ اس کے پس پردہ جدلیاتی مادیت کا نظام کام کرتا رہتا ہے۔ اسی لیے ترقی پسند ادیب اپنے آپ کو سماجی ذمہ داری بھی مانتے ہیں، تاہم ان کا یقین تھا کہ وہ فن، حسن اور افادیت تینوں کو ساتھ لے کر چلیں گے اور چلے بھی۔ جنھوں نے ترقی پسند عشقیہ، رومانی شاعری کا مطالعہ نہیں کیا وہ بیگانۂ محض ہیں، بے خبر بھی۔ لیکن یہ بھی سچ ہے کہ ترقی پسند شاعروں نے سماجی شاعری اور احتجاجی شاعری پر زیادہ زور دیا اور بحث و تمحیص سے یہ نتیجہ بھی برآمد کیا کہ بامقصد لمحاتی شاعری بہرحال مبہم و بے مقصد شاعری سے بہتر ہوتی ہے اور یہ حقیقت ہے۔ بقول ایلیا اہرن برگ کہ اگر اک مخصوص لمحے میں ملک و قوم کی تقدیر کا فیصلہ ہو رہا ہو تو لمحاتی شاعری بھی دائمی شاعری کے شانہ بشانہ کھڑی ہو جاتی ہے۔ علی سردار جعفری نے بھی کہا تھا:

"ہمیں اس شاعری کی بھی ضرورت ہے جو ایک وقتی لمحے کی ضرورت کو پورا کر رہی ہو اور اس شاعری کی بھی جو لمحاتی اور وقتی سطح سے بلند ہو کر دائمی قدر کی حیثیت بھی حاصل کر سکے... ہر شاعری کی شاعری وقتی ہوتی ہے، حسن ہے کوئی اور اسے نہ مانے لیکن میں اپنی جگہ یہ کہتا ہوں اگر ہم اگلے وقتوں کا راگ الاپیں گے تو بے سُرے ہو جائیں گے۔ آنے والے زمانے کا راگ جو بھی ہوگا وہ آنے والی نسلیں گائیں گی۔ ہم تو آج ہی کا راگ چھیڑ سکتے ہیں"۔

غرض کہ ترقی پسند تحریک نے ادب کی پوری شعریات اور جمالیات ہی بدل کر رکھ دی۔ مشاہدے کی جگہ مجاہدے نے لے لی۔ خیال کی جگہ مادے نے۔ انسانیت، اشتراکیت اور انقلابیت سب شیر و شکر ہو گئے۔ ان تمام متبدل نظریات، محرکات کو سمجھے بغیر اس تحریک کو سمجھا نہیں جا سکتا۔

ادب تاریخی تسلسل، سماجی تہذیب

(بقیہ صفحہ ۶ پر)

# اردو دنیا

## اردو میڈیم اسکولوں کے سوال پر حکومت یوپی کے پاس جواب نہیں

**سماجوادی پارٹی کی حکومت کے دو سال پورے ہونے پر وزیر اعلا نے اپنی حصولیابیاں شمار کرائیں، مگر اردو میڈیم اسکول سے متعلق سوال کو ٹال گئے**

لکھنؤ (۱۵ رمارچ)۔ وزیر اعلا اکھلیش یادو نے اپنی حکومت کے دو برس مکمل ہونے پر یہاں ایک پریس کانفرنس میں اپنی حکومت کی حصولیابیوں کا تفصیل سے ذکر کیا لیکن جب سماجوادی پارٹی کے منشور میں شامل اردو میڈیم اسکول قائم کرنے کے وعدے کے بارے میں وزیر اعلا سے پوچھا گیا تو انھوں نے اصل سوال کو ٹال دیا اور کہا کہ حکومت نے معلم اردو والوں کی تقرری کردی ہے۔ واضح ہو کہ اسمبلی انتخابات کے موقعے پر اپنے منشور میں سماج وادی پارٹی نے اردو لسانی اقلیت کی معتدبہ آبادی والے اضلاع میں پرائمری، مڈل اور ہائی اسکول سطح پر سرکاری اردو میڈیم اسکولوں کے قیام کی بات کی تھی، لیکن حکومت سازی کے بعد سے اس پر کوئی پیش رفت نہیں ہوئی۔ سماجوادی پارٹی حکومت کے دو برس مکمل ہونے پر پارٹی دفتر پر بلائی گئی پریس کانفرنس میں وزیر اعلا نے کہا کہ دو سال کی مدت میں حکومت نے ان بھی وعدوں کو پورا کرنے کا کام کیا ہے جن کا ذکر ۲۰۱۲ء کے انتخابی منشور میں تھا۔ انھوں نے کہا کہ عوام نے جو بھروسہ قائم کیا تھا اسے سماجوادی حکومت نے برقرار رکھا ہے۔ جب ان سے یہ پوچھا گیا کہ تمام کوششوں کے باوجود امن و قانون کے مسئلے پر حکومت کی گرفت کمزور کیوں ہے۔ وزیر اعلا نے کہا کہ جہاں اور جب بھی کوئی واردات ہوئی حکومت نے سخت کارروائی کی ہے۔ وزیر اعلا اکھلیش یادو سے جب یہ سوال کیا گیا کہ آپ کی پارٹی نے اترپردیش میں اردو میڈیم اسکول قائم کرنے کا وعدہ کیا تھا، کیا پارٹی نے اپنا موقف تبدیل کرلیا ہے؟ اس سوال پر انھوں نے کہا کہ معلم اردو والوں کی تقرری کردی گئی ہے۔ جب وزیر اعلا سے یہ کہا گیا کہ معلم اردو کا مسئلہ الگ ہے تو انھوں نے جواب دیا کہ پالی ٹیکنک میں اردو پڑھانے جانے کی بات ہورہی ہے۔ وزیر اعلا نے بہرحال اردو میڈیم اسکولوں کے قیام کے سلسلے میں کوئی واضح جواب نہیں دیا۔ (انقلاب۔ دہلی)

## اردو کی ترقی و ترویج کے لیے
## متعدد تجاویز کو سیاسی جماعتوں کے منشور میں شامل کرنے کا مطالبہ

جگتیال، تلنگانہ (۲۶ رمارچ)۔ علاحدہ ریاست تلنگانہ میں اردو زبان اور اردو ذریعہ تعلیم کی ترقی و ترویج کے لیے تحریک اردو تلنگانہ کی جانب سے تلنگانہ کی تمام سیاسی جماعتوں کو تجاویز پیش کی گئی ہیں اور ان سے مطالبہ کیا گیا ہے کہ وہ اپنے انتخابی منشور میں ان امور کو شامل کریں۔ صدر تحریک اردو تلنگانہ خان ضیا کی زیر قیادت ایک وفد نے اس سلسلے میں آج سابق ریاستی وزیر جی جیون ریڈی سے ملاقات کی اور ان سے درخواست کی کہ وہ تحریک اردو تلنگانہ کی ان تجاویز کو کانگریس کے انتخابی منشور میں شامل کروانے کی کوشش کریں۔ ٹی جیون ریڈی نے تمام تجاویز کو منشور ساز کمیٹی کے سامنے رکھنے کا یقین دلایا۔ جیون ریڈی نے اس موقعے پر کہا کہ کانگریس ایک سیکولر جماعت ہے اور یہ جماعت اقلیتوں اور اردو زبان کی ہمہ جہت ترقی کے لیے پوری طرح سنجیدہ ہے۔ تحریک اردو تلنگانہ نے جو تجاویز پیش کی ہیں ان میں اردو زبان کی بہ حیثیت دوسری سرکاری زبان عمل آوری کے لیے بااختیار نگران کمیٹی کے قیام کے مطالبے کے علاوہ اردو میڈیم کے مستحق ایسے طلبہ کو بھی فیس ری ایمبرسمنٹ اور اسکالرشپ کے دائرے میں لانے کا مطالبہ شامل ہے جو غربت کی وجہ سے ریگولر تعلیم ترک کرکے فاصلاتی طریقے سے اعلا تعلیم حاصل کرنے پر مجبور ہیں۔ تجاویز میں دینی مدارس کے فارغ طلبہ کے سرٹیفکیٹس کو سرکاری ملازمتوں میں کارآمد تصور کرنے اور عالم کی سند کو [illegible] کے مماثل قرار دینے کا مطالبہ کیا گیا ہے۔ اس سلسلے میں بہار اور اترپردیش کی حکومتوں کا حوالہ دیا گیا ہے۔ ادارہ ادبیات اردو کے فاضل کو دوبارہ انٹرمیڈیٹ کے مماثل قرار دینے اور عالم اردو کو ایس ایس سی کے مماثل قرار دینے کی تجاویز بھی پیش کی گئی ہیں۔ علاوہ ازیں اردو اکادمی کے کمپیوٹر سنٹرس اور لائبریری کے ملازمین کو باقاعدہ بنانے اور انھیں سرکاری ملازمین کے تمام فوائد مہیا کرنے کی تجویز بھی پیش کی گئی ہے۔ تلنگانہ کی بیشتر یونیورسٹیوں میں اردو میڈیم ڈگری کورسس کی منظوری کے باوجود نہ تو کسی سرکاری ادارے کی جانب سے اور نہ ہی پرائیویٹ پبلشرس کی جانب سے اردو میں نصابی کتب شائع کی جاتی ہیں، مجبوراً طلبہ کو اپنے طور پر ترجمے اور نوٹس کا سہارا لینا پڑتا ہے جو مشکل ہے۔ یونیورسٹی سطح پر نصابی کتب کا اردو ترجمہ اور نصابی کتب کی چھپائی کے لیے سرکاری اردو پبلی کیشن ڈویژن قائم کیا جائے۔

(رہنمائے دکن۔ حیدرآباد)

## فہرست رائے دہندگان (ووٹر لسٹ) کی اردو میں اشاعت

حیدرآباد (۳۰ رمارچ)۔ 'بزم جمہور' نے پارلیمانی حلقہ بیدر (کرناٹک) میں لوک سبھا انتخاب کی فہرست رائے دہندگان کو اردو زبان میں شائع کرنے کا خیر مقدم کرتے ہوئے کہا کہ یہ الیکشن کمشنر مسٹر جعفر اور بیدر کے رکن پارلیمنٹ ڈاکٹر ایم دھرم سنگھ کی کامیاب اور موثر نمائندگی اور اردو زبان سے ان کی غیر معمولی محبت کا ثبوت ہے۔ واضح رہے کہ ڈاکٹر دھرم سنگھ (سابق چیف منسٹر کرناٹک) عثمانیہ یونیورسٹی کے اردو گریجویٹ ہیں اور انھی کی موثر نمائندگی پر بیدر آصفیہ میں پہلی مرتبہ اردو مشاعرے کا سرکاری سطح پر انعقاد بھی عمل میں آیا۔

(سیاست۔ حیدرآباد)

## اہل اردو کو اردو کی بقا اور فروغ کے لیے خود ہی لڑائی لڑنی ہوگی

کولکاتا۔ اس استدلال کے ساتھ کہ مغربی بنگال میں گزشتہ ۳۵ سالوں سے اردو کے ساتھ ناانصافیوں کا سلسلہ جاری ہے۔ سابق مرکزی وزیر و ممبر پارلیمنٹ سلطان احمد نے کہا ہے کہ اہل اردو کو اردو کی بقا اور فروغ کے لیے خود اپنی لڑائی لڑنی ہوگی۔ انجمن ترقی اردو مغربی بنگال کی جانب سے منعقد اردو کنونشن سے خطاب کرتے ہوئے مرکزی وزیر سلطان احمد نے کہا ہے کہ ترنمول کانگریس کے اقتدار میں آتے ہی اردو کو دوسری سرکاری زبان کا درجہ دیا گیا اور اس کے لیے اسمبلی میں لنگویج ایکٹ میں بھی تبدیلی کر کے قانونی درجہ دیا گیا، مگر اردو کے فروغ کے لیے ابھی بہت کچھ کیا جانا باقی ہے۔ انھوں نے کہا کہ صرف کاغذی سطح پر سرکاری زبان کا درجہ مل جانے سے کسی بھی زبان کا فروغ نہیں ہوتا ہے بلکہ ضرورت اس بات کی ہے کہ اردو کے فروغ کے لیے جدوجہد کرنے والے اردو کے نفاذ کے لیے عملی جدوجہد کریں۔

سلطان احمد نے واضح کیا کہ مغربی بنگال میں اردو کو سرکاری زبان کا درجہ اور اس کے عملی طور پر نفاذ کی کوشش کا مطلب ہرگز نہیں ہے کہ اردو والے بنگلہ زبان کا مخالف ہے۔ بنگال میں اردو کو دوسری سرکاری زبان کا درجہ اور اہل اردو کو اپنی مادری زبان میں تعلیم حاصل کرنے کا آئینی حق ہے۔ ہندستان کے آئین نے انھیں یہ حق دیا ہے، اس لیے کوئی بھی اسے اس حق سے محروم نہیں کرسکتا ہے۔ سابق مرکزی وزیر سلطان احمد نے اردو کے فروغ کے لیے انجمن ترقی اردو کے مطالبات کی حمایت کرتے ہوئے یہ یقین دہانی کرائی ہے کہ وہ انجمن ترقی اردو کو ہر ممکن تعاون کرنے کو تیار ہیں۔ سابق مرکزی وزیر سلطان احمد نے کہا کہ بایاں محاذ کے دور میں اردو اکیڈمی کا سالانہ بجٹ محض چند لاکھ تھا، مگر ممتا بنرجی نے اکیڈمی کے بجٹ میں تین کروڑ مقرر کیا اور امید ہے کہ اگلے بجٹ میں اکیڈمی کا بجٹ آٹھ کروڑ کردیا جائے گا۔

مغربی بنگال کے ریاستی وزیر جاوید احمد خان نے یہ اعتراف کیا کہ بنگال میں ابھی اردو کو صرف کاغذی سطح پر ہی سرکاری زبان کا درجہ ملا ہے۔ مگر عملی سطح پر ابھی بہت ہی کام باقی ہے۔ اردو کے مسائل اب بھی باقی ہیں۔ انھوں نے کہا کہ اردو اسکولوں میں ایس ٹی، ایس سی کا کوٹہ ہونے کی وجہ سے اساتذہ کی بہت ہی کمی ہے۔ اس کی وجہ سے اردو اسکولوں کا معیار بھی گر رہا ہے۔ انھوں نے کہا کہ وزیر اعلا ممتا بنرجی نے مسلمانوں کے ایک وفد کے سامنے خود وزیر تعلیم برتیا بسو کو فون پر ہدایت دی تھی کہ اس سمت میں کام کیا جائے۔ (انقلاب۔ دہلی)

## موتی لال نہرو (کالون) اسپتال کے
## صدر گیٹ کے سائن بورڈ سے اردو کو ختم کردیا گیا

الٰہ آباد (۲۷ رمارچ)۔ عام طور سے یہ بات مشہور ہے کہ ہندی اور اردو دونوں سگی بہنیں ہیں، اب یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ ایک بہن کو تو لاڈ پیار سے پالا جائے اور دوسری کو نکال باہر کیا جائے۔ خاص کر واقع موتی لال نہرو (کالون) اسپتال میں کچھ ایسا ہی نظارہ دیکھنے کو مل رہا ہے جس کے صدر گیٹ پر کبھی جلی حرفوں میں اسپتال کا نام ہندی اور اردو دونوں زبانوں میں لکھا ہوا کرتا تھا لیکن آج اس کا نام صرف ہندی زبان میں رہ گیا ہے اور اردو کو نکال باہر کردیا گیا ہے۔

ایک طرف جہاں سماج وادی پارٹی اپنی حکومت میں اردو دوستی کا دعویٰ کرتی ہے وہیں اس کی حکومت میں کچھ ایسے بھی افراد موجود ہیں جو اعلا عہدے پر ہوکر اردو کے ساتھ سوتیلا سلوک کررہے ہیں۔ واضح رہے کہ مذکورہ اسپتال نام ہی سے اپنی تاریخی شناخت بیان کرتا ہے۔ یہ اسپتال ریلوے اسٹیشن سے متصل کولون گنج کے علاقے پر گنجان بستی خاص کیڈ میں آباد ہے جہاں شہر الٰہ آباد کے علاوہ دور دراز سے کمزور و بیمار افراد اپنے علاج و معالجے کے لیے آتے ہیں، جس میں ہندی جاننے والے بھی ہوتے ہیں اور اردو سمجھنے والے بھی، اسی خیال سے شاید اس اسپتال کے سائن بورڈ پر اسپتال کا نام ہندی اور اردو دونوں زبان میں لکھا گیا تھا لیکن ہندی کے ساتھ تو انصاف کیا گیا اور اردو کے ساتھ ناانصافی۔ اس سلسلے میں کالون اسپتال کے چیف میڈیکل سپرنٹنڈنٹ اے کے راج سنگھ سے جب سائن بورڈ سے اردو ہٹانے کا سبب معلوم کیا گیا تو انھوں نے کہا مجھے معلوم نہیں ہے کہ اس کا نام اردو میں بھی لکھا ہوا تھا۔ جب نمائندہ روزنامہ انقلاب نے انھیں چھ ماہ پہلے کی تصویر دکھائی جس میں اسپتال کا نام اردو اور ہندی دونوں زبانوں میں لکھا ہوا تھا تو انھوں نے کہا دراصل اسپتال کا ابھی ابھی پینٹنگ روغن کرایا گیا ہے، سائن بورڈ کو جلد ہی اردو میں بھی تحریر کرادیا جائے گا۔

(انقلاب۔ دہلی)

## خواجہ احمد عباس نے اپنے اصولوں سے سمجھوتہ نہیں کیا

### 'انقلاب' کے مصنف کے انقلابی نظریات کی اردو یونیورسٹی میں بھرپور ستائش

حیدرآباد (۲۰ مارچ)۔ شعبۂ ترسیل عامہ و صحافت مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی اور کے اے عباس صدی تقریب کمیٹی نئی دہلی کی جانب سے دو روزہ صدی تقاریب 'خواجہ احمد عباس: ایک افسانوی شخصیت اور ان کی وراثت' کے سلسلے کی کڑی کے تحت آج سی پی ڈی یو ایم ٹی آڈیٹوریم، مانو میں ایک روزہ سیمینار بہ عنوان 'خواجہ احمد عباس: سینما، صحافت اور ادب' کا انعقاد عمل میں آیا۔ ایک روزہ سیمینار کی صدارت یونیورسٹی کے پرو وائس چانسلر ڈاکٹر خواجہ محمد شاہد نے کی۔ ڈاکٹر خواجہ محمد شاہد نے اپنے صدارتی تقریر میں کہا کہ خواجہ احمد عباس صدی تقریب سے ہمیں ایک بات نے بہت متاثر کیا اور وہ یہ ہے کہ خواجہ صاحب کی زندگی کے کچھ اصول تھے جن پر انھوں نے کبھی سمجھوتہ نہیں کیا۔ انھوں نے کہا کہ یوں لگتا ہے کہ ان کے قول و فعل میں تضاد کی گنجائش ہی نہیں تھی وہ جو چاہتے تھے ہر حال میں وہ کر دیتے تھے۔ خواجہ شاہد نے کہا کہ خواجہ احمد عباس گاندھی جی کو اپنا رول ماڈل مانتا تھا اور آج ہمارے سماج میں مسئلہ یہ ہے کہ رول ماڈل ہی غائب ہیں۔ ہم سب کو زندگی کے کچھ اصول بنانے چاہیے اور ان پر کاربند رہنے کی ہر ممکن کوشش کرنی چاہیے۔ ہم جس شعبے میں بھی جائیں اس کے ساتھ عوامی جذبات جڑے ہونے ہونے چاہیے۔ نامور نقاد اور کالم نویس شمیم طارق نے خواجہ احمد عباس سے متعلق اپنے مقالے 'خواجہ عباس: جیسا دیکھا جیسا جانا' میں خواجہ احمد عباس کی زندگی کے مختلف پہلوؤں کا احاطہ کیا۔ انھوں نے کہا کہ میں نے خواجہ احمد عباس کو دیکھا بھی، سنا بھی اور ان کا مداح بھی رہا ہوں۔ خواجہ عباس ایک ایسی شخصیت تھی جنھوں نے اپنے کالموں کے ذریعے لسانی یکجہتی کی مثال پیش کی۔ پروفیسر قدوائی نے کہا کہ خواجہ احمد عباس نے اپنا صحافتی کیریئر بہ حیثیت کالم نویس شروع کیا اور وہ پہلے ایسے شخص ہیں جنھوں نے اپنے کالموں کے ذریعے انسانی موضوعات کو چھوا۔ فلم ہدایت کار و پروڈیوسر ساگر سرحدی نے اپنے مقالے میں خواجہ عباس صاحب کے ساتھ اپنے تعلقات کا ذکر کیا۔ انھوں نے کہا کہ عباس صاحب آرٹ سینما کے حق میں تھے اور ہر ایک مسئلے پر لکھتے تھے۔ پروفیسر بیگ احساس (سابق صدر شعبۂ اردو حیدرآباد سنٹرل یونیورسٹی) نے خواجہ احمد عباس کے ناول 'انقلاب' پر اپنا مقالہ پیش کیا۔ انھوں نے کہا کہ عباس صاحب نے بہترین صلاحیتیں فلم کو دیں۔ انھوں نے ہی متوازی سینما کی بنیاد ڈالی جس کو بعد میں آرٹ سینما کا نام دیا گیا۔ انھوں نے خواجہ احمد عباس کے ناول 'انقلاب' کی بات کرتے ہوئے کہا کہ یہ ناول ایک سیاسی ناول ہے اور اس میں انھوں نے ایک سیاسی چہل پہل کو پیش کیا ہے۔ اسکرین رائٹر انجم رجب علی نے اپنے مقالے میں خواجہ احمد عباس کے فلمی کیریئر پر سیر حاصل بحث کی۔ اسسٹنٹ پروفیسر ڈاکٹر محمد فرید نے نظامت کے فرائض انجام دیے۔

(سیاست۔ حیدرآباد)

## اردو صحافیوں کو سیاسی پارٹیوں کی میٹنگ کی اطلاع تک نہیں دی جاتی

شاہجہاں پور (۱۵ مارچ)۔ مسلمانوں اور اردو کی سب سے زیادہ خیر خواہ اور ہمدرد ہونے کا دعویٰ کرنے والی سماج وادی پارٹی کے امیدوار یہاں اردو زبان اور اردو اخبارات کو نظر انداز کر رہے ہیں۔ اس جانب توجہ دلانے کے باوجود وہ سنجیدگی نہیں دکھا رہے ہیں۔ پارلیمانی انتخاب میں یوں تو سبھی سیاسی پارٹیاں مسلمانوں کے ووٹ حاصل کرنے کے لیے طرح طرح کے حربے استعمال کر رہی ہیں۔ اپنے آپ کو مسلمانوں کا سب سے زیادہ ہمدرد اور خیر خواہ بتا رہی ہیں لیکن وہیں اردو کی حقیقت اور طاقت سے سیاسی پارٹیاں چشم پوشی کرتی ہوئی نظر آ رہی ہیں۔ سماج وادی پارٹی جو مسلمانوں اور اردو کی سب سے بڑی ہمدرد ہونے کا دعویٰ اور تشہیر کرتی ہے اس کے امیدوار اور پارٹی عہدیداران اردو زبان کے اخبارات کی اہمیت کو نظر انداز کرتے ہوئے اردو صحافیوں کو پارٹی میٹنگ اور پروگراموں کی اطلاع دینا ضروری نہیں سمجھتے ہیں۔ اتنا ہی نہیں، امیدواروں کے پارٹی دفاتر میں دیگر زبانوں کے اخبارات منگائے جارہے ہیں مگر اردو اخبارات ان دفتروں سے ندارد ہیں۔

(اردو ایکشن۔ بھوپال)

## اردو تعلیم کے مسائل کے حل کے لیے متحدہ جدوجہد ناگزیر

### اساتذہ جواب دہ اور فرض شناس بن کر تدریسی خدمات انجام دیں

بنگلور (۱۵ مارچ)۔ محفل نساء بنگلور کے زیر اہتمام منعقدہ یک روزہ سیمینار بعنوان 'ریاست کرناٹک میں اردو تعلیمی مسائل اور ان کا حل' میں کلیدی خطبہ پیش کرتے ہوئے محکمۂ تعلیمات عامہ کے کمشنر محمد محسن (آئی اے ایس) نے کہا کہ اردو تعلیم اور اردو مدرسوں کے ایک دو نہیں کئی طرح کے متعدد مسائل ہیں لیکن افسوس اس بات کا ہے کہ آج تک ان مسائل سے متعلق نہ کوئی مثبت رپورٹ ہے اور نہ ہی کوئی مثبت قدم اس سلسلے میں اٹھایا گیا ہے۔ دراصل اردو کے مسائل اور ان کے حل کے لیے ہر طبقے کی الگ الگ سوچ ہے۔ اس کی مثال ایسی ہی ہے جیسے پانچ اندھوں نے کسی ہاتھی کی تشریح کی تھی۔ ہر ایک اپنے اپنے انداز میں ان مسائل کو پیش کرتا آیا ہے لیکن متحدہ طور پر بھی اردو مدرسوں اور اردو تعلیم کے فروغ کے لیے کوئی ٹھوس کوشش نہیں کی گئی ہے۔ گزشتہ آٹھ ماہ سے بہ حیثیت کمشنر محکمۂ تعلیمات عامہ اپنے تجربات کا ذکر کرتے ہوئے محمد محسن نے کہا کہ حالاں کہ آج ہمارے ادارے پرائمری تا میڈیکل اور انجینئرنگ کالج اقلیتوں کے نام پر چلا رہے ہیں لیکن ان اسکولوں اور کالجوں میں جس طبقے کو زیادہ نمائندگی دی جاتی تھی وہ انھیں دی جا رہی ہے اور سیٹوں کو فروخت کیا جا رہا ہے۔ یہ تعلیمی ادارے اقلیتی اداروں کے نام پر حکومت سے سہولتیں لیتے ہیں مگر جب دینے کا موقع آتا ہے تو اپنے طبقے کو ان کا حق نہیں دیا جاتا۔ مسٹر محمد محسن نے اس بات پر افسوس ظاہر کیا کہ ان کے پاس تعلیمی اداروں کے ذمہ داران، اساتذہ اور تعلیمی انجمنوں کے وفود ملاقات کے لیے آتے ہیں۔ لیکن وہ بھی اردو زبان یا تعلیمی ترقی کے لیے کوئی ٹھوس منصوبہ یا مشورہ لے کر نہیں آتے۔ زیادہ تر مطالبات ذاتی نوعیت کے ہی ہوتے ہیں، مثلاً انھیں پروموشن چاہیے یا تبادلہ۔ اردو کے تعلق سے کوئی ٹھوس مسئلہ یا مطالبہ کسی نے پیش ہی نہیں کیا ہے۔ آپ نے بہ حیثیت کمشنر محکمۂ تعلیم جب مسائل کا جائزہ لیا تو یہ بات سامنے آئی کہ محکمے سے جڑے بی ای او اور ڈیا اصلاح کے نمائندے، اداروں کے پاس بھی کوئی ٹھوس مشورہ یا تجویز نہیں ہے جسے وہ ان کے آگے پیش کرسکیں۔ ریاست بھر میں 34 ڈی پی آئی موجود ہیں مگر ان میں ایک بھی ڈی پی آئی اقلیتی طبقے کا یا اردو تعلیم کے مسائل کا کماحقہ علم رکھنے والا نہیں ہے جسے اردو کے مسائل سے واقفیت ہو۔ ہمارے ذمہ دار احباب خود اصل مسائل سے ناواقف ہیں اور انھیں یہ تجربہ بھی نہیں ہے کہ کس سے مانگا جائے اور کیا کام لیا جائے انھیں نہیں معلوم کہ ڈی ڈی پی آئی یا محکمے کے کمشنر سے کیا کام لیے جاسکتے ہیں۔ زیادہ تر انجمنیں اور ادارے اپنے مسائل کے سلسلے میں کسی وزیر کو میمورنڈم پیش کرکے خاموش ہو جاتے ہیں۔ بہتر یہ ہے کہ میمورنڈم کی نقل محکمے کے کمشنر اور دیگر ذمہ دار عہدیداروں کو بھی دیے جائیں تاکہ مسائل کو حل کرنے میں آسانی ہو۔ کسی مسئلے کو موثر طریقے سے کس طرح اور کس کے پاس پیش کرنا ہے یہ سلیقہ پہلے آنا چاہیے۔ اردو کے فروغ اور تعلیمی ترقی کے لیے مختلف اداروں اور انجمنوں کو متحدہ کوشش کرنی ہوگی۔ انھوں نے کہا کہ یہ بڑے دکھ کی بات ہے کہ ریاست میں عربی منظور شدہ مدارس کا نصاب گزشتہ 25 برسوں سے بدلا نہیں گیا ہے اور نہ ہی نصاب کی کتابیں ہی دستیاب ہیں۔ ان مدارس میں نصابی کتابوں کی زیروکس شدہ کاپیاں ہی استعمال میں ہیں۔ انھوں نے اس مرتبہ حکومت اور وزیر تعلیم کو اعتماد میں لے کر نصاب اور کتابوں کی اشاعت کے لیے منظوری حاصل کی ہے۔ اساتذہ میں جب تک اپنی ذمہ داری کا احساس پیدا نہ ہوگا اردو کی ترقی ممکن نہیں۔ حکومت اسکول بلڈنگ فراہم کرتی ہے۔ مختلف سرکاری اسکیموں میں فنڈ کی کوئی کمی نہیں ہے۔ ان ساری اسکیموں سے اردو اسکول اور اساتذہ فائدہ اٹھائیں۔ نلی کلی اسکیم دوسری زبان کے اسکولوں میں چار سال پہلے شروع ہو چکی ہے جب کہ اردو اسکولوں میں اسے اب شروع کیا جا رہا ہے۔ اساتذہ بچوں کو صحیح تعلیم اور بہتر تعلیم دینے کے جذبے سے کام کریں۔ اردو اسکولوں میں 10 تا 15 بچوں کے لیے 4 تا 6 اساتذہ ہیں لیکن نہ طلبہ کی حاضری پر اساتذہ توجہ دے رہے ہیں اور نہ ہی خود ڈیوٹی پر حاضر رہتے ہیں۔ اساتذہ کے پاس بچوں کا کوئی فالو اپ ہی نہیں ہے۔ شاید ہی کوئی ٹیچر بچوں کی غیر حاضری پر کبھی ان کے گھر گئے ہوں گے یا والدین سے بات کیے ہوں گے۔ اساتذہ کو یہ فطرت بدلنی ہوگی، اردو ہائی اسکولوں کی حالت اور زیادہ خراب ہے۔ ایس ایس ایل سی امتحان سر پر ہے مگر یہاں بچوں کی تعلیم کا معیار افسوسناک ہے۔ اساتذہ اردو کی روٹی کھا رہے ہیں تو یہ ان کی ذمہ داری ہے کہ اردو کے فروغ کے جذبے کے تحت کام کریں۔ جناب سید محمد ہیری سی ایم ڈی ہیریس گروپ نے اس سیمینار کا افتتاح کرتے ہوئے کہا کہ اردو اساتذہ احساس کمتری کا شکار ہونے کے بجائے عزم اور حوصلہ دکھائیں۔ کسی بھی کامیابی کے لیے قربانی کے جذبے کے تحت کام کریں گے تو اردو کے بہت سارے مسائل حل ہو سکتے ہیں۔ ریٹائرڈ آئی اے ایس افسر عزیز اللہ بیگ نے بھی خطاب کیا۔ محفل نساء کی صدر ڈاکٹر شائستہ یوسف نے صدارت کی۔ ریٹائرڈ ڈپٹی کمشنر آف پولیس این ڈی ملا اور سابق صدر انجمن اماسہ ایم ایچ اعجاز علی نے مہمانان اعزازی کے طور پر شرکت کی۔ محترمہ فریدہ رحمت اللہ نے نظامت کے فرائض انجام دیے۔

(سالار۔ بنگلور)

## انجمن ترقی اردو کمرہٹی کے وفد کی میونسپلٹی کے چیئرمین سے ملاقات

کمرہٹی (مغربی بنگال)۔ انجمن ترقی اردو کمرہٹی کا ایک چھ رکنی وفد کمرہٹی میونسپلٹی کے چیئرمین اور ایگزیکیٹو آفیسر سے ۱۸ مارچ ۲۰۱۳ء کو ان کے آفس میں ملا۔ وفد نے چیئرمین کو بتایا کہ اب جب کہ حکومت مغربی بنگال نے اردو کو دوسری سرکاری زبان کا درجہ دیا ہے تو اس کا نفاذ ان میونسپلٹیوں میں ہونا چاہیے جہاں دس فیصد اردو آبادی ہے، جس میں کمرہٹی بھی شامل ہے۔ چیئرمین صاحب نے ایگزیکیٹو آفیسر کو تمام اہم نکات نوٹ کرتے اور متعلقہ دفتروں سے رابطہ کرکے اردو داں کلرک کے تقرر، کمرہٹی کے اردو گرلس ہائی اسکول کی منظوری، ICDS میں اردو اساتذہ کا تقرر اور راستوں کی نشان دہی کرنے کے لیے لگائے جانے والے تمام سائن بورڈوں میں اردو کو جگہ دینے کی یقین دہانی کرائی۔ موصوف نے وفد سے کھل کر اردو والوں کے مسائل پر گفتگو کی اور اپنی دلی خواہش کا اظہار کیا کہ وہ حکومت کی جانب سے لیے گئے تمام فیصلوں پر فوری طور پر عمل کریں گے تاکہ حکومت کے گزٹ کا عملی نفاذ ہو۔ اس وفد میں محمد عیسیٰ انجینئر، پرویز احمد انجینئر، ماسٹر سراج الدین (ریاستی سکریٹری)، محمد شمیم (علاقائی سکریٹری)، ماسٹر ارشد جمال اور ماسٹر عادل رشید شامل تھے۔

(اخبار مشرق۔ کلکتہ)

## بقیہ: نسل پرستی اور دیگر حیوانی...

صفحہ ۸ سے آگے

میری شادی برقرار تھی اور ہمارا پورا خاندان امریکہ کی سیاحت پر تھا۔ واشنگٹن میں میرے خسر رائے بہادر اوبرائے نے اعلان کیا کہ وہ کسی سیلف سروس کیفے میں جاکر وہاں کے نظام کا مطالعہ کرنا چاہتے تھے۔ اگلی صبح میرے خسر، میری خوش دامن، میرے شوہر نکی اور میں، ہم سب اپنے ہوٹل سے مطلوبہ کیفے کی تلاش میں نکلے۔ ہم نے وہاں ناشتہ کیا، اس سے قبل رائے بہادر صاحب نے اس کیفے کے نظام کار کا بغور معائنہ کیا اور اپنے اشتیاق کی تسکین کی۔ انھوں نے یہ تمام تر معلومات فراہم کیں کہ وہاں کس طرح گاہکوں کی فرمائشوں کی تکمیل ہوتی تھی اور کس طور پر تمام کام انجام پذیر ہوتے تھے۔

خورد و نوش کا سلسلہ ختم ہوا تو میں ٹیکسی کی تلاش میں باہر نکلی۔ ایک ٹیکسی میری جانب آئی اور سڑک کی منڈیر پر ٹھہر گئی۔ میں نے اس ٹیکسی کے قدرے معمر شوفر سے کہا کہ دوسری سواریاں ابھی آرہی تھیں اور اسے چند لمحے انتظار کرنا پڑ سکتا ہے۔ اس نے بڑے تحمل سے میری بات پر سر تسلیم خم کر دیا۔

اسی ساعت ایک بڑی کار گھن گرج کی آوازیں کرتی آئی اور اس نے ٹیکسی کو بری طرح رگڑ کر رکھ دیا۔ اس کار کا ڈرائیور لفظاً نہیں عملاً پہیوں پر کھڑا ہو گیا اور تب جاکر وہ لمبی چوڑی کار ایک جھٹکے کے ساتھ رکی اور اس کا مالک چھلانگ لگا کر باہر آیا۔ وہ ایک لحیم شحیم سفید فام شخص تھا۔ اس نے ٹیکسی کے شوفر پر ایک نگاہ غلط انداز ڈالی جو اتفاق سے سیاہ فام تھا۔ پھر اس نے انتہائی فحش اور بھیانک نسل پرستانہ گالیاں بکنی شروع کر دیں اور گالیوں کے درمیان ہی اس نے ٹیکسی ڈرائیور سے بڑے پر یقین لہجے میں کہا کہ وہ اسے برطرف کراکے چھوڑے گا کیوں کہ اس کی قبیل کے لوگ اسی سلوک کے مستحق تھے۔

میں یہ سب برداشت نہ کر سکی۔ میں اس کی کار کے قریب گئی اور اپنی نرم گفتاری کی آخری حدوں تک برقرار رکھتے ہوئے انتہائی سرد لہجے میں اسے مخاطب کیا: ''معاف کیجیے، جو کچھ ہوا ہے وہ سب میں نے دیکھا ہے۔ اس کی ٹیکسی کھڑی ہوئی تھی۔ آپ گاڑی چلا کر لائے، اس لیے، تصادم کے ذمے دار آپ ہیں۔ اب اگر آپ اس معاملے کو آگے لے جانا چاہتے ہیں تو میں اس ڈرائیور کے حق میں بخوشی شہادت پیش کروں گی۔''

ستم ظریفی یہ کہ ہم اگلے روز ہندستان واپس آرہے تھے۔ اس لیے میں نے اپنا مفصل بیان تحریر کیا اور باضابطہ دستخط کر کے ٹیکسی ڈرائیور کے حوالے کر دیا۔ میں نے اسے اپنا پتا بھی دیا اور یقین دلایا کہ بیمہ کمپنی کے کسی بھی سوال کا جواب دینے کے لیے میں تیار ہوں گی۔ اس واقعے کے چند دن بعد متعلقہ بیمہ کمپنی کا ایک لمبا چوڑا سوال نامہ مجھے موصول ہوا، جس کے جوابات تحریر کر کے میں نے بذریعہ ڈاک روانہ کر دیے۔

پھر اس کے چند ہفتے بعد، مجھے اس ٹیکسی ڈرائیور کی جانب سے اظہار تشکر کا ایک خط ملا۔ تاہم میرے خیال میں اسے میرا شکریہ ادا کرنے کی چنداں ضرورت نہیں تھی۔ مجھے بھی مسرت تھی کہ میں نے وہی کیا جو مجھے کرنا چاہیے تھا۔ کیوں کہ بہرکیف میں نسل پرست رویے اور رجحان سے ناواقف نہیں تھی۔ میں نے اپنی زندگی کا اچھا خاصا حصہ ہندستان میں گزارا ہے، جہاں ہر قسم کی نسل پرستی اور ذات پرستی کا رواج ہے۔ صرف یہی نہیں کہ اس ملک میں صدیوں سے ذات پات کا ایک ایسا نظام کارفرما ہے جس نے اعلا و ادنی تمام ذاتوں کے ساتھ بڑا ہی بے رحمانہ سلوک کیا ہے۔ جی نہیں، ہندستان میں اس کے علاوہ دیگر اقسام کی نسل پرستی بھی موجود ہے۔ ہماری اقدار میں کسی شخص کی جلد کا رنگ بڑی اہمیت کا حامل ہے۔

---

### مدر ٹریسا

جب میں نے ڈوم کے ساتھ آبادی کے موضوع پر اس کی کتاب اے میٹر آف پیپل (A Matter of People) پر کام کرنا شروع کیا تو ہمارا پہلا پڑاؤ کلکتہ تھا، جہاں ہمیں مفلسوں کی مسیحا، غریب بستیوں کے باسیوں کے لیے سنت مانا جاتا اور خواتین کے حقوق کی علمبردار، مدر ٹریسا سے ملاقات کرنا تھی۔ وہی مدر ٹریسا جنھوں نے اپنی قوت اور اپنے اختیار کے تحت ہر ممکن ہتھیار کو استعمال کر کے ضبط تولید کے تمام طریقوں کو استعمال کرنے سے روک رکھا تھا۔

ڈوم نے اس صورت حال کے صرف تاریک پہلو کو مد نظر رکھا۔ تاہم میں نے اس بات کو سمجھنے کی سعی کی کہ مدر ٹریسا ایک کٹر کیتھولک عیسائی راہبہ تھیں، نیز مسیحیت کے مرکز ویٹکن کے سلسلے کی ایک کڑی تھیں، لہٰذا اس کے احکام کی پابند بھی۔ جب ہماری ملاقات ہوئی تو حتمی طور پر ان دونوں یعنی مدر اور ڈوم کے مابین یکسر مختلف نظریات عیاں ہو گئے۔

''آپ میرے ساتھ عبادت میں شریک ہوں۔'' مدر ٹریسا نے کہا، لیکن ڈوم نے صاف انکار کر دیا۔ میں مدر کے ساتھ ایک سادہ چھوٹے سے کلیسا میں گئی۔ وہاں سمنٹ کے کھردرے فرش پر دو زانو ہو کر مدر ٹریسا نے عبادت کی۔ جب ہم دونوں مصروف عبادت تھے، اس وقت ڈوم باہری برآمدہ ناپنے میں مصروف تھا۔

اس کے بعد جب مدر ٹریسا باہر آئیں تو انھوں نے ڈوم سے کہا:

''تم جاؤ اور لیلا کو میرے پاس چھوڑ جاؤ۔''

''ہرگز نہیں۔'' ڈوم نے لگ بھگ غرا کر کہا۔

اب اس میں تعجب کی کوئی بات نہیں کہ جب ڈوم کی کتاب آئی تو اس میں مدر ٹریسا کا کوئی حوالہ نہیں تھا۔ تاہم میرا خیال ہے کہ ڈوم نے ایک دل چسپ واقعے کو محض اپنے ذاتی تعصب کے سبب اپنی کتاب کا حصہ نہیں بننے دیا۔

بالآخر جب ویٹکن نے اس امر پر اتفاق کر لیا کہ خاندانی منصوبہ بندی گناہ نہیں ہے، نیز خواتین بھی اس پیچیدہ عمل میں حصہ لے سکتی ہیں، تب مدر ٹریسا کی رضاکارائیں کریکی نوریم اسٹریٹ کی پسماندہ کیتھولک بستی میں جاکر انھیں خاندانی منصوبہ بندی کے طریقوں سے آگاہ کرنے لگیں۔ دراصل یہ کام آسان نہیں تھا کیوں کہ اس کے لیے خواتین کے ماہانہ نظام کا غائر مطالعہ کر کے یہ پتا لگانا پڑتا تھا کہ خواتین کے لیے افزائش نسل کے لحاظ سے سب سے کارگر وقت کون سا ہوتا ہے، جب ان کے حاملہ ہونے کے امکانات سب سے زیادہ ہوتے ہیں۔ جب کسی خاتون کو ان خاص دنوں کا ادراک ہو جائے تو وہ اس دوران احتیاط برت سکتی ہے۔

چوں کہ ان میں زیادہ تر خواتین غیر تعلیم یافتہ تھیں، اس لیے کلیسا کے ارباب اختیار نے یہ طے کیا کہ ان عورتوں کو رنگ برنگے دانوں والی مالائیں دے دی جائیں۔ اس کے بعد انھیں مختلف رنگوں کے حساب سے دھاگے میں پرو کر الگ الگ قسم کے دنوں کے لیے مخصوص کرنا تھا اور ان کے توسط سے اپنے مخصوص دن شمار کرنے تھے۔ ان دانوں اور مالاؤں کی تقسیم کی ذمے داری مسز لوجوائے اور ان کی ساتھی دیگر رضاکاروں پر تھی، نیز انھیں اس بات کو بھی یقینی بنانا تھا کہ ان مالاؤں کو درحقیقت استعمال بھی کیا جائے۔ اس مقصد کے لیے ان تمام کارکنوں کو سب سے بڑی بستی تلجلا خانے کے ساتھ ساتھ تمام ایسی بستیوں کا گشت لگا کر اس خدمت کو انجام دینا تھا۔ ظاہر ہے کہ ان بستیوں کے ہر گھر میں کئی کئی بچے تھے اور ان میں اکثر بھوکے ننگے رہتے تھے۔

اس کے بعد ہوا یہ کہ کچھ گھروں میں تو مالاؤں کو توڑ کر دوسرے دھاگوں میں بے ڈھنگے طریقے سے پرو دیا گیا اور کچھ گھروں میں بچوں کو ان دانوں اور منکوں سے کھیلتے دیکھا گیا۔ جب کہ کچھ عورتوں نے اپنے گھروں کے چھوٹے چھوٹے پوجا گھروں میں دیوی کی مورتی کی پشت پر ان دانوں کو رکھ دیا۔ اس توقع کے ساتھ کہ ان کی جانب سے دیوی ماتا ہی ان دانوں کو شمار کرنے کا فرض انجام دے دیں گی اور اس کے بعد بھی بچے مسلسل پیدا ہوتے رہے۔

دراصل جہاں تک مسز لوجوائے کا تعلق تھا، مسز لوجوائے کو ہر ماہ آٹے کی ایک چھوٹی سی بوری (جس میں میرے خیال میں کوئی پانچ کلو آٹا ہوتا ہوگا) ایک کلو چینی اور چائے کے ایک پیکٹ کے علاوہ، کچھ مقدار میں مٹی کا تیل فراہم کیا جاتا تھا۔ اس کے علاوہ نہ دودھ کا کوئی سوال تھا، نہ چاول اور نہ ہی سبزیوں کا۔ البتہ انھیں دو سو (200) روپے ماہانہ مشاہرہ ضرور ملتا تھا۔ جو ظاہر ہے کہ نہ پوری طرح ان کے خاندان کا پیٹ بھر سکتا تھا اور نہ ہی تن ڈھک سکتا تھا۔ ان کے خاندان میں ایک بے روزگار شوہر کے علاوہ پانچ عدد بچے بھی تھے۔

تاہم مسز لوجوائے بدستور کام کرتی رہیں۔ وہ اپنے عہد کی پابند تھیں اور کبھی حرف شکایت بھی زبان پر نہیں لاتی تھیں۔

میں ان کے لچک دار رویے کو دیکھ حیران اور ان کی ہمت، حوصلے اور مستقل مزاجی کی معترف تھی۔ اس لیے ایک مرتبہ میں نے انھیں مع اہل خانہ عشائیے کے لیے مدعو کیا۔ ان کے اہل خانہ نے بڑے ہی محتاط انداز میں کھانا کھایا، کیوں کہ مسز لوجوائے نے اس بات کو ملحوظ رکھا تھا کہ اشیائے خورد و نوش حسب ضرورت ہی طلب کی جائیں اور ایک حد سے زیادہ ہرگز نہیں۔ تاہم میں یہ محسوس کر سکتی تھی کہ بچے بری طرح کھانے پر گر رہے تھے۔ مسز لوجوائے نے مجھ سے کہا کہ وہ کوئی دوسری ملازمت کرنے کے لیے تیار تھیں۔ میں نے سوچا کہ وہ پارک ہوٹل میں داخلی نگراں کی حیثیت سے خدمت انجام دے سکتی تھیں۔ دراصل ہمارا قیام پارک ہوٹل میں ہی تھا، اس لیے میں نے اس کے منتظم سے بات کی۔ اس نے مجھے بتایا کہ ہوٹل میں داخلی نگراں کی ایک اسامی خالی تھی اور میری بتائی ہوئی تفصیلات کی روشنی میں انھیں یہ محسوس ہوا کہ مذکورہ مسز لوجوائے اس منصب کی ضروریات کے تحت مناسب و موزوں امیدوار ہو سکتی تھیں، اس لیے انھوں نے مسز لوجوائے کو ملاقات روبرو کے لیے طلب کر لیا۔ مجھے یقین تھا کہ مسز لوجوائے کی سادگی اور صدق دلی انتظامیہ کو ضرور متاثر کرے گی، لیکن جب میں نے بعد میں منتظم صاحب سے پوچھا کہ کیا رہا، تو انھوں نے ٹکا سا جواب دے دیا کہ ''مادام، ہم انھیں ملازمت نہیں دے سکتے۔''

''مگر کیوں نہیں؟'' میں نے تجسس کے ساتھ دریافت کیا۔

''مادام، دراصل مسز لوجوائے نام سن کر ہم یہ سمجھے تھے کہ وہ گوروں میں سے ہوں گی۔'' انھوں نے وجہ بھی بتا دی۔

''گوری؟'' میں نے استعجاب سے پوچھا۔

''جی ہاں، کسی اینگلو انڈین کی طرح، لیکن وہ تو ایک دم سیاہ فام نکلیں۔'' ان کا جواب تھا۔

اور بات ختم ہو گئی۔

(باقی آئندہ)

## بقیہ: مولانا شبلی نعمانی...

صفحہ ۲ سے آگے

نے ان کی اردو شاعری اور فارسی شاعری کے کلیات الگ الگ شائع کیے۔ ان کی فارسی شاعری کس مقام و مرتبے کی حامل تھی اس کا اندازہ ہمیں مولانا ابوالکلام آزاد کی اس گراں قدر اور قیمتی رائے سے ہوتا ہے جسے قارئین کی عدالت میں پیش کرتے ہوئے انھوں نے لکھا تھا کہ ''ہندستان میں فارسی کا خاتمہ مرزا غالب پر نہیں علامہ شبلی نعمانی پر ہوا''۔ فارسی شعر و ادب کے ماہرین جانتے ہیں کہ فارسی شاعری میں غالب کا کیا مقام و مرتبہ ہے اور مولانا ابوالکلام آزاد جنھیں ہم عربی اور فارسی کا مستند عالم سمجھتے ہیں، ان کا یہ کہنا کہ ہندستان میں فارسی شاعری کا خاتمہ مرزا غالب پر نہیں بلکہ علامہ شبلی نعمانی پر ہوا ہے، اپنے آپ میں ایک ایسی رائے ہے جو شبلی کے قد کو بہت اونچا کر دیتی ہے۔

مولانا شبلی کی اردو شاعری کے کلیات میں ہمیں کئی ایسی نظمیں ملتی ہیں جو ہمارے سینے میں درد کا ایک طوفان برپا کر دیتی ہیں اور جب شبلی نے یہ نظمیں کہی تھیں تو ان کے سینے میں ملت کے درد کی کیا کیفیت رہی ہوگی آسانی سے سمجھ میں آسکتا ہے۔ میں یہاں ان کی ایسی صرف دو نظموں کا ذکر کرنا چاہوں گا، ان دو نظموں میں ایک کا نام 'حادثہ کانپور' اور دوسری کا نام 'ہنگامہ طرابلس و بلقان' ہے۔ 'حادثہ کانپور' کی دلدوز نظم مولانا شبلی نے اس وقت کہی تھی جب انگریز حکومت کی عمل داری میں کانپور کی ایک تاریخی مسجد کی مسماری ہوئی تھی، مسجد کی اس مسماری سے مسلمانوں میں شدید غم و غصہ ابھر کر سامنے آیا جس کی ترجمانی مولانا شبلی نے بہت عمدہ ڈھنگ سے کی تھی۔

'ہنگامہ طرابلس و بلقان' بھی ایک ایسی ہی دردناک نظم ہے جو ان کے نوک خامہ پر آئی اور ملت اسلامیہ کو خون کے آنسو رلا گئی۔ اس یادگار نظم کے چند اشعار میں یہاں پیش کرتا ہوں تاکہ آپ شبلی کے نقطۂ نظر کی اچھائیوں کے ساتھ ساتھ ان کی شاعری کے کس بل کو بھی محسوس کر سکیں۔ شبلی نے 'ہنگامہ طرابلس و بلقان' اس طرح شروع کی ہے:

حکومت پر زوال آیا تو پھر نام و نشاں کب تک
چراغ کشتۂ محفل سے اٹھے گا دھواں کب تک
قبائے سلطنت کے گر فلک نے کر دیے پرزے
فضائے آسمانی میں اڑیں گی دھجیاں کب تک
مراکش جا چکا، فارس گیا اب دیکھنا یہ ہے
کہ جیتا ہے یہ ٹرکی کا مریض سخت جاں کب تک
یہ سیلاب بلا بلقان کا جو بڑھتا جاتا ہے
اسے روکے گا مظلوموں کی آہوں کا دھواں کب تک

شبلی نعمانی کی یہ مشہور نظم چوبیس اشعار پر مشتمل ہے۔ ہم پوری نظم کو یہاں درج کرنے سے قاصر ہیں، اس کا سبب محض مضمون کی طوالت کا خوف ہے۔ قارئین کی معلومات اور دل چسپی کے لیے ہم مشہور ترقی پسند شاعر کیفی اعظمی کی تضمین کی کئی اس مشہور نظم کے چند اشعار بھی یہاں پیش کرتے ہیں جسے انھوں نے شبلی کی نظم پر کی تھی۔ کیفی اعظمی اگرچہ اشتراکی شاعر تھے لیکن وہ شبلی نعمانی کے شاعرانہ کمالات کے قائل تھے۔ اپنی تضمین کا نام انھوں نے ''مژدہ'' رکھا تھا، اس کے کچھ اشعار ہم پیش کرتے ہیں ملاحظہ فرمائیں اور اچھی شاعری کا لطف حاصل کریں۔

زوال ملت اسلامیہ کے نوحہ خواں شبلی
مبارک ہو کہ کروٹ لے رہا ہے آسماں شبلی
سنانے کو ہمارا کون اب نام و نشاں شبلی
دھواں کر پاکہ اڑنے کو ہیں چنگاریاں شبلی
یقینا موت کا پیغام ہے ظلم کی خامی
بتا بھی تو دیا کرتے ہے اکثر درد کا کامی
اٹھا ہوتے ہیں منتشر اوراق اسلامی
چھپیں تم سلطانی میں اب یہ آندھیاں شبلی

مضمون کے آخر میں ہم یہ عرض کریں گے کہ مولانا شبلی نعمانی ہمہ جہت شخصیت کا نام ہے، ان کی یہ شہرت ان کے ہمہ گیر کام کی وجہ سے ہے۔ ان کی وفات کے سو سال مکمل ہونے آرہے ہیں دارالمصنفین جو ان کے نام سے اعظم گڑھ میں قائم کیا گیا ہے اس موقعے پر ہندستان کے مختلف شہروں میں سیمینار منعقد کرنے کا منصوبہ رکھتا ہے اس منصوبے کے روح رواں پروفیسر اشتیاق احمد ظلی صاحب ہیں، خدا ان کے اس منصوبے کو کامیاب و کامران کرے۔ آمین!

☆☆☆

## بقیہ: تحریک۔ تفہیم۔ تدریس

صفحہ ۳ سے آگے

دفرواز اور انسانی پیچ و خم کے بطن سے ہی جنم لیتا ہے۔ اسی سے وابستہ یہ سوالات بھی بنیادی حیثیت رکھتے ہیں کہ انسانی حیات کے اس زم گرم سفر میں بشریت کی اس جدوجہد میں اقتدار کی کشاکش غرض کہ انسانی سماج کے منظرنامے میں ادیب کا رول کیا ہے؟ ادیب کا سماجی منصوب اور اس کی سماجی وابستگی کیا ہے، وہ بھی اس تنقید و تجزیہ کا حصہ ہے اور اس کو صرف سرقوں سے ہی کام، حقیقتوں اور بصیرتوں سے اسے کوئی تعلق نہیں۔ ان سوالات اور زمانے کی سمت و رفتار کی تفہیم ہی بصیرتوں کے در کھولتی ہے۔ بہ قول شاعر:

اس آنکھ سے وابستہ ہے تو تیرہ بصیرت
وہ آنکھ جو رفتار جہاں دیکھ رہی ہے

افسانوں کی طرح تحریکوں کی بھی عمر ہوا کرتی ہے، اس کو اسی تناظر میں قبول کرنا چاہیے۔ آج ترقی پسند نظریہ ادبی فضا میں تحلیل ہو چکا ہے۔ یہ جو نیا ادب لکھا جارہا ہے جس میں وہ لت ہے، تانیثیت ہے، فرقہ واریت ہے وغیرہ؛ یہ سب کے سب ترقی پسند فکر و نظر کی توسیع ہے، لیکن یہ بھی ہے کہ افسانوں کی طرح تحریکات کے باطن کو سمجھنا آسان نہیں تاہم اس کے قریب تر تو پہنچا ہی جا سکتا ہے۔ عہد، معاشرہ اور جملہ سماجی اور سیاسی تغیرات کی تفہیم کے بغیر کسی بھی تحریک کی تخلیق کو مکمل طور پر سمجھ پانا ممکن نہ سہی تو مشکل ضرور ہے کہ ادب خلا میں جنم نہیں لیتا وہ راست طور پر زندگی سے رشتہ رکھتا ہے اور صرف رشتہ ہی نہیں بلکہ اور آگے بڑھ کر بہ قول ضیا ہینڈرسن:

''عمدہ ادب کا مقصد انسان کو تبدیل کرنا اور انسان کے ذریعے سماج کو بدلنا ہے''۔

ان تمام نزاکتوں اور جہتوں کو سمجھے بغیر نہ ادب و تحریک کی تفہیم ممکن ہے اور نہ ہی تعلیم و تدریس اور نہ ہی شخصیت کی تعمیر۔

☆☆☆

# نسل پرستی اور دیگر حیوانی خصوصیات

لیلا نائیڈو

دوسری قسط

## لیلا نائیڈو کی انگریزی خودنوشت Leela Naidu: A Patchwork Life کے ایک باب سے

انگریزی سے ترجمہ **مظفر حسین سید**
(29/11- سر سیّد روڈ، دریا گنج، نئی دہلی110002)
Email: syedmh92@yahoo.com

### مدر ٹریسا اور دیگر نسل پرست

میں پندرہ برس کی تھی تو میں نے 'اِیکول انٹرنیشنل' میں اپنی تعلیم مکمل کر لی اور اب مجھے آکسفورڈ جانا تھا اور میرے والدین کو ہندوستان واپس جانا تھا اس لیے، ہم سب پیرس پہنچے اور اپنی اپنی زندگیوں کو علاحدہ کرنے کی تیاری کرنے لگے۔ ایک دن میں وہ سیڑھیاں طے کر رہی تھی، جو ایونیو موزارٹ اور ایونیو تھیوڈور روز ویلٹ کی جوڑی ہیں۔ تبھی مجھے ایک جانا پہچانا تشویش بھرا چہرہ نظر آیا۔

''احمد'' میں نے حیرت سے کہا۔

''ہیلو لیلا'' اس نے جواب دیا۔

''تم یہاں کیا کررہے ہو؟'' میں نے اس سے پوچھا، حالاں کہ مجھے اس بات کا احساس تھا کہ مجھے سب پتا تھا۔

ہم زینے پر ہی بیٹھ گئے اور میں نے اسے یہ باور کرانے کی کوشش کی کہ ابھی ہم دونوں بہت کم عمر تھے۔ میں نے اسے یہ بھی بتایا کہ ہم لوگ ہندوستان واپس جارہے تھے۔ میں نے اسے مشورہ دیا کہ وہ اپنی والدہ کے پاس واپس چلا جائے۔

اس نے میری طرف دیکھا تو مجھے لگا کہ جیسے اس کا دل اس کی آنکھوں میں اتر آیا تھا۔

''سنو احمد'' میں نے کہا۔ ''تم پہلے یہ دریافت کرو کہ تم چاہتے کیا ہو۔ اگر تم پڑھنا نہیں چاہتے تو مت پڑھو مگر پھر تو طے کرو کہ تم کرنا کیا چاہتے ہو؟ پھر تم اسے کرو گے۔''

میں نے اُسے وہیں سیڑھی پر بیٹھے چھوڑ دیا۔ کئی برس بعد مجھے پتا چلا کہ وہ ایران واپس چلا گیا تھا اور وہاں بہترین دستاویزی فلم سازوں کی صحبت میں شامل ہو گیا تھا۔ اس نے شادی کر لی تھی اور اپنی بچی کا نام لیلا رکھا تھا۔ میں نے اس بات کو اپنی توصیف کے طور پر قبول کیا۔ یہ میرا قابلِ قدر سرمایہ ہے۔

ہمارے اسکول 'اِیکول انٹرنیشنل' میں نئے طلبہ کے لیے شفقت بھری نگرانی و رہنمائی کا ایک نظام رائج تھا۔ ہر طالب علم کو ایک نگراں یا رہبر دیا جاتا تھا جسے پائلٹ کے نام سے منسوب کیا جاتا تھا۔ لیکن جب میں داخل ہوئی تو یہ مان لیا گیا کہ مجھے کسی پائلٹ کی ضرورت نہیں تھی، کیوں کہ میں پہلے بھی جینوا آچکی تھی اور میں فرانسیسی زبان روانی سے بولتی تھی نیز میں گرد و پیش سے بھی بخوبی واقف تھی۔ میں وہاں کی آب و ہوا میں پہلے سے رچی بسی تھی۔

برطانیہ کے ایک یہودی تاجر کی بچی ورجینیا اسکول میں آئی تو اس کی نگرانی کا ذمہ مجھے سونپا گیا۔ اسکول کی روایت کے بموجب اُس پر یہ لازم تھا کہ ایک سہ ماہی دور کے اختتام پر وہ مجھے اپنے گھر عشائیہ کی دعوت دے۔ میرے خیال میں یہ اظہارِ تشکر کی ایک رسم تھی۔ لہٰذا ایک شام نیلے رنگ کی ایک کیڈی لیک کار ہمارے گھر کے سامنے رکی اور مجھے اس گاڑی میں جینوا جھیل کے کنارے واقع بالائی منزل کے ایک مکان میں لے جایا گیا۔

بدقسمتی سے ایسا نہیں لگتا تھا کہ اس خاندان کو دولت کی فراوانی کی عادت تھی، اس لیے کہ ورجینیا کو نہ تو خوشنما مناظر سے دلچسپی تھی اور نہ اس تاریخی شہر میں منعقد ہونے والی موسیقی کی محفلوں اور کئی قسم کے ڈراموں و دیگر تمثیلی پروگراموں سے۔ وہ اپنی دادی کے ساتھ رہتی تھی اور ان ضعیف خاتون کو بھی اس امر سے دلچسپی تھی کہ خودکار طریقے سے روشن ہونے والی ملبوسات کی الماریوں کی نمائش کی جائے۔ میں نے بڑی فرض شناسی کے ساتھ ان کے دولت کدے کے تمام تر روشن اندرونی گوشوں نیز دیگر اشیا کی تعریف کی۔ دراصل یہ سہولت اپنے آپ میں بڑی مفید تھی کہ اگر وقت نیم شب میں بھی کسی کو لباس تبدیل کرنے کی ضرورت پیش آجائے تو خودکار روشن الماری کے سبب یہ کام آسان ہو جائے اور بڑی حد تک خوشگوار بھی۔ حالاں کہ خواب گاہ کو بھی حسبِ ضرورت روشن کیا جاسکتا تھا تاہم اس سادہ سی سچائی کا اظہار کیا جاتا تو یہ اس ضعیف خاتون کی مسرت کو دو چند کرنے کے جیسا ہوتا۔ لہٰذا میں نے تمام چیزوں میں گہری دلچسپی کا اظہار کیا اور مسلسل کرتی رہی۔ لیکن جب اُن بزرگ خاتون نے متعدد الماریوں کی نمائش کا سلسلہ جاری رکھا تو میری تعریف بھی میکانکی انداز اختیار کرتی گئی۔

پھر ہم لوگ عشائیہ کے لیے کھانے کی میز پر بیٹھے۔ ہم صرف تین تھے اور کمرہ کافی وسیع و عریض تھا۔ ایک باوردی بیرا کھانا پیش کر رہا تھا۔ قابل ذکر ہے کہ میز پوش ایک دم چوکور تھا۔ ظروف قیمتی تھے لیکن کھانا کچھ عجیب بے مزہ اور نامانوس سا تھا۔ اگرچہ دسترخوان پر مچھلی بھی تھی، جو اس وقت اعلا طبقے کی حیثیت کی مظہر مانی جاتی تھی۔ ورجینیا نے مچھلی پروست کا خاص اہتمام کیا تھا اور خود اپنے لیے اس نے مچھلی کے ٹکڑوں پر دو طرح مکھن بھی لگوایا تھا۔ اس کے بعد سفید چٹنی کے ساتھ مرغ اسٹیو سامنے آیا۔ سالن خوب مرغن تھا۔ آخر میں مقدار میں کم مگر ذائقے دار شیرینی بھی پیش کی گئی۔

ورجینیا نے اعلان کیا کہ اب میں تمھیں اپنے والد کا دفتر دکھاؤں گی۔

'اوہ' میں نے سوچا کہ کیا میں اپنے لطف و انبساط کو قابو میں رکھ پاؤں گی۔'

اس کے بعد ہم ایک دفتر میں گئے، جس کی سجاوٹ سے لگتا تھا جیسے ہالی ووڈ کے کسی سیٹ سے اٹھا کر لایا گیا ہو۔ وہاں ایک بڑی سی میز تھی، آرام دہ کرسیاں تھیں اور چار سو کتابیں رکھی تھیں۔ ہر طرف دبیز پردے لگے تھے اور ایک سمت کھلے میدان کا نظارہ تھا اور میز کے اوپر ایک لیمپ رکھا تھا، اس کے شیڈ کا رنگ پرانے پوست جیسا تھا۔

''تمھارے خیال میں یہ کس چیز سے بنا ہوگا'' ورجینیا نے پوچھا۔

اس سلسلے میں میرا کوئی قیاس بھی نہیں تھا مگر یہ طے تھا کہ ورجینیا مجھے بتانے والی تھی۔

''انسانی پوست سے۔'' اس نے بڑے فخر سے کہا۔

میں نے اس کی جانب بے یقینی کے ساتھ دیکھا۔

''ہاں یہ آشوٹز سے آیا ہے۔'' اس نے کہا۔

میری بے یقینی اور بڑھی۔ اس نے آہستہ سے لیمپ کا رخ بدلا۔ دوسری طرف ایک نمبر لکھا ہوا تھا۔ یہ وہ نمبر تھا جو ایذا رسانی کیمپ میں قید کیے جانے والے ہر مظلوم کے بازو پر گدوا دیا جاتا تھا۔

اب میرے معدے میں اتھل پتھل ہونے لگی تھی۔ میں اٹھی اور بھاگی۔ ایک دم اس بالا خانے کے باہر بچھی سڑک پر سرپٹ اور بالآخر اپنے گھر پہنچ گئی۔ میں نے خود کو اپنی ماں کے اوپر لاد دیا اور ان کی گود میں گھسی روتی رہی، تاآنکہ میری حالت کچھ بہتر ہوئی۔ مجھے اس بات کی بے حد خوشی تھی کہ دوبارہ کبھی ورجینیا سے بات کرنے کی نوبت نہیں آئی۔

### نسل پرست اور بھی تھے

میرے ناخوشگوار تجربات کا سلسلہ ابھی ختم نہیں ہوا تھا۔ میری زندگی میں ابھی اور بھی کئی نسل پرست آنے تھے حتیٰ کہ اس وقت بھی جب کہ شادی کے بعد میں ایک ایسے صاحبِ ثروت خاندان کی بہو تھی، جس کی دسترس میں ہر قسم عیش و آرام تھا۔ اس کے باوجود ہمارے ارد گرد ہمیشہ ایسے لوگ منڈلاتے دیکھے جاسکتے تھے، جو چھوٹے چھوٹے معاملات میں بھی رنگ و نسل کو بنیاد بنا کر اپنے رویے کا تعین کرتے تھے۔

اس وقت تک کئی اور برائے سے

(بقیہ صفحہ ۲ پر)



مدیر: اطہر فاروقی
شریک مدیر: محمد عارف خاں
پرنٹر پبلشر: شاہد خاں    مطبوعہ: شمر آفسٹ پرنٹنگ پریس، دہلی
مالک: انجمن ترقی اردو (ہند)، اردو گھر ۲۱۲، راؤز ایونیو، نئی دہلی-۱۱۰۰۰۲
قیمت (فی شمارہ): دو روپے، سالانہ: ۸۵ روپے (بیرونی ممالک: آٹھ امریکن ڈالر)
Phones: 23237212, 23237214
E-mail: hamarizaban@atuh.org
http://www.atuh.org